دینی مدارس اور عصر حاضر

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام
فکری نشستوں اور تربیتی ورکشاپس کی روداد

مرتب:
شبیر احمد خان میواتی

الشریعہ اکادمی

کتاب: دینی مدارس اور عصر حاضر
مرتب: شبیر احمد خان میواتی
ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ
فون: 055-4271741 / 4000394
aknasir2003@yahoo.com
باہتمام: دار الکتاب، اردو بازار، لاہور
طابع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
اشاعت اول: اگست ۲۰۰۷
قیمت:

تقسیم کنندہ:
دار الکتاب، غزنی مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 042-7235094

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

دینی علوم کی حفاظت اور مسلم معاشرے میں دینی اقدار کے فروغ کے لیے دینی تعلیم کے نظام کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے، جبکہ غیر اسلامی فکر وتہذیب کے استیلا کے اس دور میں اس نظام کو زیادہ مستحکم اور موثر بنانے کی ضرورت واہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس سلسلے میں دینی مدارس کے نظام تعلیم اور معاشرتی کردار کے مختلف پہلوؤں پر بحث وتمحیص، پیش آمدہ چیلنجوں کی نشان دہی اور مدارس کے نظام میں پائے جانے والی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کے عمل کا تسلسل کے ساتھ جاری رہنا خود اس نظام کی بقا اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

اسی ضرورت کے احساس کے تحت الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ وقتاً فوقتاً مدارس کے نصاب و نظام کے حوالے سے مختلف فکری وتربیتی نشستوں اور ورکشاپس کا اہتمام کرتی رہتی ہے جس میں تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھنے والے اہل علم کے اظہار خیال اور دینی مدارس کے اساتذہ ومنتظمین کے باہمی تبادلہ افکار کے ذریعے سے زیر بحث نکات پر بحث ومباحثہ کو آگے بڑھانے میں مدد ملتی ہے۔ ان نشستوں اور ورکشاپس میں کیے جانے والے خطابات اور پڑھنے جانے والے مقالات کا زیادہ تر حصہ اکادمی کے ترجمان ماہنامہ 'الشریعہ' میں شائع ہو چکا ہے اور ان کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر برادرم شبیر احمد خان میواتی صاحب نے انھیں مرتب کر کے کتابی صورت دے دی ہے جس پر وہ ہماری اور موضوع سے دلچسپی رکھنے والے تمام اصحاب فکر کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔

تعلیم وتدریس اور بالخصوص دینی مدارس کے نظام تعلیم میں بہتری لانا اور اسے دور جدید کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ بنانا الشریعہ اکادمی کا خصوصی مشن ہے اور زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ اس سلسلے میں پیش رفت کی توفیق عطا فرمائے اور اس حوالے سے کی جانے والی کوششوں اور کاوشوں کو بارآور فرمائے، آمین یا الٰہ العالمین۔

محمد عمار خان ناصر
ڈپٹی ڈائریکٹر
الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ
۲۹ / جولائی ۲۰۰۷

پیش گفتار

امت مسلمہ نے دنیا میں علم کی اہمیت، اس کی ترویج و اشاعت اور اس کی توسیع کے لیے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ دنیا بھر کی تہذیبوں اور جمیع مذاہب عالم کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان سب میں علم کا حصول کچھ خاص لوگوں تک محدود تھا۔ عوام الناس کے کئی طبقات پر اس کے اخذ و اکتساب کے دروازے بند تھے، حتیٰ کہ فلاسفہ یونان کے سرخیل افلاطون کے افکار کا اگر بہ نظر تعمق جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی معاشرے کے کئی طبقات کے لیے علم کے حصول کا قائل نہیں تھا۔ یہ شرف صرف خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی آفاقی شریعت کو حاصل ہے کہ جس نے ادنیٰ و اعلیٰ، بندہ و آقا، سلاطین و رعایا، امیر و غریب، غرض زندگی کے تمام شعبوں سے وابستہ مردوں اور خواتین کے لیے حصول علم کے دروازے کھول دیے۔ اسی بنا پر حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ نے اپنی تالیف ''تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام'' میں امت مسلمہ کا اختصاصی امتیاز ''علم'' کو ہی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں دیگر مذاہب کی بالعموم اور ملت عیسوی کی تعلیمات کا بالخصوص مدلل محاکمہ کرتے ہوئے دین اسلام کے اس امتیازی وصف کو اجاگر کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ساری دنیا پر علوم کے اخذ و اکتساب اور نشر و اشاعت کے دروازے اسی دین حق کی آمد کے بعد کھلنا شروع ہوئے۔

آج دنیا میں جس قدر بھی علم و حکمت، سائنس و ٹیکنالوجی اور فلسفہ و دانش کی روشنی بکھری ہوئی ہے، اسے اسلام کے سراج منیر کی ضیا پاشیاں اور پرتو ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ محض خطیبانہ تعلّی اور

ادیبانہ ترنگ نہیں، بلکہ اس دعوے کی پشت پر تاریخ کی مدلل اساس موجود ہے۔ اسلام کے روز اول سے لے کر اب تک اسلاف واخلاف، سب نے مقدور بھر بلکہ اپنی بساط سے بھی بڑھ کر قندیل علم کو روشن کرنے میں اپنی عمریں بتا دیں۔ بعثت نبوی سے لے کر زمانہ حال تک یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا رہا، قندیل سے قندیل روشن ہوتی رہی اور آج بھی امت کے دردمند ارباب دانش وحکمت اور علما وفضلا کا طبقہ اس تڑپ اور سوز کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیے ہوئے ہے۔

اسی تڑپ، اسی دردمندی، اسی لگن اور اسی نصب العین کا ایک اظہار الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں مختلف اوقات میں منعقد ہونے والی فکری وتربیتی نشستیں اور ورکشاپس بھی ہیں جن میں تعلیم وتعلم کے شعبے سے وابستہ ارباب علم وفضل کو مدعو کر کے عصر حاضر میں مدارس کو درپیش چیلنجز اور مسائل پر اظہار خیال کا موقع فراہم کیا جاتا رہا ہے۔ ان نشستوں میں نہ صرف مدارس دینیہ کے ارباب بست وکشاد کو بلایا گیا بلکہ یونی ورسٹی اور کالج سے تعلق رکھنے والے دانش وروں کو بھی مدعو کیا گیا اور انھوں نے علمی متانت اور دیانت فکر کے ساتھ نہایت پرمغز خیالات کا اظہار فرمایا اور ان نشستوں میں مدارس دینیہ کو پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کا سامنے کرنے کی راہیں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔

خاکسار راقم الحروف الشریعہ اکادمی سے گہرا قلبی تعلق رکھتا ہے اور اکادمی کے ترجمان ماہنامہ 'الشریعۃ' کی مجلس مشاورت کا رکن ہونے کا اعزاز بھی راقم کو حاصل ہے۔ اکادمی کے ڈائریکٹر جناب علامہ ابوعمار زاہدالراشدی کی خواہش پر میں نے ان تربیتی نشستوں میں پیش کردہ خطبات اور مقالات کو ترتیب دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عصر حاضر میں مدارس دینیہ کی ذمہ داریوں اور ان کو درپیش مسائل کے ادراک کے لیے ایک مفید رہنما ثابت ہوگی۔

الحمدللہ الشریعہ اکادمی کے سلسلہ مطبوعات کا آغاز ہو چکا ہے اور اب تک علامہ راشدی کی تحریروں کے حسب ذیل مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں:

۱۔ حدود آرڈیننس اور تحفظ نسواں بل

۲۔ جناب جاوید احمد غامدی کے حلقہ فکر کے ساتھ ایک علمی وفکری مکالمہ

۳۔ دینی مدارس کا نصاب ونظام: نقد ونظر کے آئینے میں

۴۔ جامعہ حفصہ کا سانحہ: حالات وواقعات اور اثرات ونتائج کا ایک جائزہ۔

ان کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی فکر انگیز مطبوعات کی تیاری اور اشاعت کا کام جاری ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ الشریعہ اکادمی کی ان دینی مساعی اور علمی خدمات کو قبول فرمائے، آمین۔

شبیر احمد خان میواتی

۳۰؍ جولائی ۲۰۰۷

خواندگی، تعلیم اور دینی اقدار کا فروغ

دوسری سالانہ الشریعہ تعلیمی کانفرنس

(منعقدہ ۱۴ مارچ ۹۶ء)

’’خواندگی، تعلیم اور دینی اقدار کا فروغ‘‘
کے عنوان پر الشریعہ تعلیمی کانفرنس

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام دوسری سالانہ الشریعہ تعلیمی کانفرنس ۱۴ مارچ ۹۶ء بروز جمعرات مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں انعقاد پذیر ہوئی۔ کانفرنس کی پہلی نشست کی صدارت الشریعہ اکادمی کے ڈائریکٹر جنرل مولانا زاہد الراشدی نے کی اور بزرگ عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے خطاب کیا، جبکہ دوسری نشست کی صدارت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی اور سپریم کورٹ کے سابق جج، جسٹس محمد رفیق تارڑ بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے اور ان کے علاوہ مولانا زاہد الراشدی، پروفیسر غلام رسول عدیم، جناب شکور طاہر، پروفیسر عطاء الرحمٰن عتیق اور الحاج محمد اسلم رانا نے اس نشست سے خطاب کیا۔ کانفرنس میں شہر اور ضلع کے مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور گورنمنٹ ظفر علی خان ڈگری کالج وزیرآباد کے پروفیسر حافظ منیر احمد نے نظامت کے فرائض سرانجام دیے۔

کانفرنس کی پہلی نشست کا آغاز قاری احمد علی شاہد نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور اس کے بعد الشریعہ اکادمی کے ڈائریکٹر حافظ محمد عمار خان ناصر نے معزز مہمانوں اور شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ قومی مقاصد اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے حوالہ سے مروجہ تعلیمی نظاموں کا از سر جائزہ لینے کی ضرورت ہے کیونکہ ریاستی نظام تعلیم اور دینی تعلیم، دونوں اسلامی نظام

کے نفاذ کے لیے موثر کردار ادا نہیں کر رہے اور ان کی ترجیحات میں انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ دینی وعصری تعلیم کو یکجا کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں ملک کے مختلف حصوں میں تجربات کرنے والے اداروں اور شخصیات کو چاہیے کہ وہ اپنے تجربات اور جدوجہد کو مشاورت کے ایک مربوط نظام کے ساتھ منسلک کریں تا کہ اس جدوجہد کو ایک قومی تحریک کی شکل دی جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ ''سالانہ الشریعہ تعلیمی کانفرنس'' کے اہتمام کا مقصد بھی اسی احساس کو اجاگر کرنا ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت پوری دنیا میں مادی ترقی اور بدن کی آسایش کے لیے بہت کچھ ہو رہا ہے اور سائنسی علوم وفنون اس مقصد کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں مگر روحانی سکون اور موت کے بعد آنے والی ابدی زندگی کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اسباب وعوامل کی فراوانی اور سائنسی ترقی کے عروج کے باوجود انسانی معاشرہ اطمینان اور سکون سے محروم ہے، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیمی نظام کی بنیاد بدن اور روح، دونوں کی ضروریات پر رکھی جائے اور ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی طرف رجوع کیا جائے۔ انہوں نے دینی خدمات کے حوالے سے دینی مدارس کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دینی مدارس نے اسلامی علوم کی حفاظت وترویج میں مجاہدانہ خدمات سرانجام دی ہیں لیکن اب چونکہ بین الاقوامی رابطوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور دنیا سمٹ رہی ہے، اس لیے علماے کرام کو انگریزی اور دیگر بین الاقوامی زبانوں سے واقف ہونا چاہیے تا کہ وہ اسلام کی تعلیم وتبلیغ کا فریضہ زیادہ بہتر اور موثر طور پر سرانجام دے سکیں۔ انہوں نے اپنے جنوبی افریقہ اور برطانیہ کے اسفار کا حوالہ دیا اور کہا کہ ان اسفار میں انہوں نے محسوس کیا ہے کہ اگر وہ انگریزی زبان سے بھی واقف ہوتے تو وہاں کے لوگوں کو زیادہ بہتر طریقے سے اپنی بات سمجھا سکتے تھے اور مافی الضمیر کا زیادہ موثر اظہار کر سکتے تھے۔ انہوں نے علما کو تلقین کی کہ وہ گفتگو اور خطاب میں لوگوں کی ذہنی سطح اور ان کی کمزوریوں کا لحاظ رکھیں کیونکہ سختی کے ساتھ بات کرنا اور طنز وتشنیع کا انداز اختیار کرنا قرآن کریم کی تعلیم کے

خلاف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون جیسے باغی اور سرکش کے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون جیسے جلیل القدر پیغمبروں کو بھیجا تو انہیں یہ ہدایت دی کہ ''اس کے ساتھ نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کر لے''۔

کانفرنس کی دوسری نشست نماز ظہر کے بعد قاری ملک عبد الواحد کی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی اور ماہنامہ المذہب لاہور کے ایڈیٹر الحاج محمد اسلم رانا نے مسیحی مشنری تعلیمی اداروں کی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسیحی تعلیمی ادارے بہتر معیار اور اچھے برتاؤ کے ذریعے سے ہمارے معاشرے میں اثر ونفوذ بڑھا رہے ہیں اور اچھے اچھے گھرانے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے مشنری اداروں کی طرف رجوع کرتے ہیں جبکہ یہ مشنری ادارے مسلمان بچوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرنے یا کم از کم اپنے مذہب سے بے گانہ کر دینے کو اپنا مشنری ہدف بنائے ہوئے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ بظاہر غیر محسوس انداز میں مختلف طریقوں سے کام لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان خاندانوں کو اس صورت حال سے آگاہ کرنے کے لیے منظّم جدوجہد کی ضرورت ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسے اچھے اور معیاری تعلیمی ادارے بھی وسیع پیمانے پر قائم کیے جائیں تا کہ مسلمان خاندان اپنے بچوں کو مشنری اداروں میں بھیجنے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔

گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرانوالہ کے پروفیسر غلام رسول عدیم نے ''پاکستان میں خواندگی کی شرح اور دینی مراکز'' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا جس میں بین الاقوامی رپورٹوں کے حوالے سے پاکستان میں خواندگی کے تناسب کا ذکر کرتے ہوئے دینی مدارس اور مراکز پر زور دیا گیا کہ وہ بھی خواندگی کی شرح میں اضافے کو اپنی ترجیحات میں مناسب جگہ دیں۔ انہوں نے کہا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کا آغاز ہی 'اقـــرا' کے لفظ سے ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا نقطہ آغاز تعلیم ہے اور معاشرہ میں تعلیم اور خواندگی کا فروغ ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں خواندگی کی شرح افسوس ناک حد تک کم ہے جس کا ایک سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے، اس کی مناسبت سے تعلیمی اداروں

کی تعداد نہیں بڑھ رہی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قومی بجٹ میں تعلیم کے لیے جتنی رقم مختص ہونی چاہیے، وہ نہیں ہو پاتی اور تیسری وجہ یہ ہے کہ مروجہ تعلیمی نظام میں نا اہلی، کرپشن اور کام چوری نے راہ پالی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا کام اس نظام سے لیا جا سکتا ہے، وہ بھی پورا نہیں ہو رہا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے دینی مدارس و مکاتب لکھنے پڑھنے کی استعداد کی حد تک خواندگی کے فروغ کو اپنی ترجیحات میں شامل کر لیں اور گرد و پیش کے مختلف طبقات کے لوگوں کو اپنے ہاں یہ سہولت فراہم کریں تو اس سے نہ صرف یہ کہ خواندگی کی شرح میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا بلکہ دینی مدارس کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوگا اور وہ زیادہ لوگوں تک دین کا پیغام اور تعلیمات پہنچا سکیں گے۔

گورنمنٹ ڈگری کالج گوجرانوالہ کے پروفیسر عطاء الرحمٰن عتیق نے ''اکیسویں صدی کے تعلیمی تقاضے'' کے موضوع پر خطاب کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے عقلی علوم، دینی تعلیمات اور روحانی تربیت کے مراکز کو الگ الگ کر کے اسکول، مدرسہ اور خانقاہ کی تثلیث قائم کر رکھی ہے جو ہمارے مسائل کی اصل جڑ ہے جبکہ ایک انسان کو صحیح معنوں میں انسان بنانے کے لیے ان تینوں تعلیمات کی یکساں ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا میں ترقی کے ذرائع، مادی وسائل اور علوم و فنون کی فراوانی کے باوجود مار دھاڑ، افراتفری اور اضطراب و بے چینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اصل ضرورت انسان کو انسان بنانے کی ہے اور صحیح انسانی اخلاق و کردار سے آراستہ ہو کر ہی علوم، ترقی اور وسائل سے مثبت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اکیسویں صدی کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ہم اسے صحیح انسان فراہم کریں اور صحیح انسان فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسکول، دینی مدرسہ اور خانقاہ کی تثلیث کو ختم کر کے ان تینوں نظاموں کو یکجا کیا جائے اور ان کی خامیوں کو دور کر کے ان سے نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کام لیا جائے۔

پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد کے جناب شکور طاہر نے ''فروغ تعلیم میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار'' کے موضوع پر معلوماتی اور پر مغز مقالہ پیش کیا جسے مہمان خصوصی اور شرکا نے بے حد سراہا۔ انہوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن، آڈیو کیسٹ، سیٹلائٹ چینل، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای میل، فیکس اور فوٹو اسٹیٹ مشین کے کردار اور طریق کار پر تفصیلی روشنی ڈالی اور شرکاے کانفرنس کو بتایا کہ

الیکٹرانک میڈیا کے ان مختلف شعبوں کا دائرہ اثر کیا ہے اور وہ کس طریقے سے لوگوں کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج کے دور میں یہ بات بالکل درست کہی جاتی ہے کہ یہ میڈیا کا دور ہے اور کوئی گروہ، ادارہ یا قوم میڈیا کے ان ذرائع تک رسائی کے بغیر دنیا کے لوگوں تک اپنا پیغام اور پروگرام پہنچانے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات درست ہے کہ ان ذرائع کا ایک بڑا حصہ فحاشی کے فروغ اور دیگر غلط اور منفی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ ذرائع بہت بڑے دائرے میں تعلیمی مقاصد کے لیے بھی کام میں لائے جا رہے ہیں، بالخصوص ترقی یافتہ ممالک نے ان ذرائع کی مدد سے اپنے تعلیمی نظاموں کو بہت زیادہ موثر، آسان اور ہمہ گیر بنالیا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی پروگراموں میں ان ذرائع سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ میڈیا کے ان موثر ترین ذرائع کے منفی استعمال کی روک تھام کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ان کے مثبت استعمال کو فروغ دیا جائے اور نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے انہیں موثر طور پر کام میں لایا جائے۔

ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا زاہد الراشدی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب فرنگی حکمرانوں نے اس وقت کے مروجہ تعلیمی نظام کو مکمل طور پر تہہ وبالا کر دیا تھا تو دینی علوم کی حفاظت کے لیے دیوبند نے اور نئی تعلیم سے مسلمانوں کو آراستہ کرنے کے لیے علی گڑھ نے اس کردار کو ادا کیا تھا اور علمائے کرام نے مسلمانوں کے عقائد واعمال اور دین واخلاق کے تحفظ کے لیے دینی مدارس کا جال پھیلا دیا تھا جس کی وجہ سے فرنگی حکمران یہاں دینی علوم کو ختم کرنے کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے جبکہ آج اسی طرز پر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، یونیسیف اور دیگر بین الاقوامی ادارے اس بات کی منصوبہ بندی کر چکے ہیں کہ پاکستان کے ریاستی نظام تعلیم میں اسلامی تعلیمات کے موجودہ حصے کو بے اثر بنا دیا جائے اور دینی مدارس کے نظام کو کردار کشی اور ان پر ریاستی تسلط کی راہ ہموار کر کے اسے مکمل طور پر سبوتاژ کر دیا جائے جس کا علامتی آغاز بلوچستان کے پرائمری اسکول کے نصاب سے حمد باری کو خارج

کرنے کے اقدامات سے ہو چکا ہے اور پاکستان میں امریکہ اور بین الاقوامی اداروں کی بڑھتی ہوئی مداخلت کے خلاف مزاحمتی قوتیں جس تیزی سے پسپا ہو رہی ہیں، اس کے پیش نظر استعماری قوتوں کا خیال یہ ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کی طرح اب بھی پاکستان میں دینی تعلیم کے نظام کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ انہوں نے دینی مدارس پر زور دیا کہ وہ اس صورت حال پر گہری نظر رکھیں اور آنے والے وقت میں نئی ذمہ داریوں کے لیے تیار رہیں کیونکہ استعماری قوتوں کے ان مذموم عزائم کی خدانخواستہ کامیابی کی صورت میں قوم کو دینی تعلیم کا متبادل نظام فراہم کرنے کا فریضہ ''مسجد کی چٹائی'' کو ہی سرانجام دینا ہوگا۔

مہمان خصوصی جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد رسوائے زمانہ میکالے نے ایک شیطانی نظام تعلیم مرتب کر کے دعویٰ کیا کہ اس سے ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر خیالات وتمدن میں انگریز ہوگا۔ اس نظام تعلیم کے نفاذ سے دو مقاصد کا حصول اس کے پیش نظر تھا: (۱) دفتروں کے لیے کلرک پیدا کرنا، (۲) مسلمانوں کو ان کے دین سے بے گانہ کر کے دینی اقدار سے محروم کرنا۔ چنانچہ نوآبادیاتی دور کے ڈیڑھ صدی پر محیط لمبے دورانیے میں فرنگی نے مسلمانوں میں اپنے کاسہ لیس وطن فروش ٹوڈیوں کے خاندانوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ اپنی چال ڈھال، نشست و برخاست اور بود وباش میں آج تک مغربی معاشرہ کی نقل مطابق اصل ہیں اور وطن عزیز میں قیادت کا تاج گزشتہ پچاس برس سے انہی خاندانوں کے افراد کے سروں پر سجتا چلا آ رہا ہے۔ ٹوڈیوں کی اس نسل کے ذریعے سے ایک طرف تو عصری نظام تعلیم کو بد سے بدتر شکل میں ڈھالا جا رہا ہے اور دوسری طرف نیو ورلڈ آرڈر کے سب سے بڑے ہدف دینی مدارس پر یلغار اور مار دھاڑ کے ارادے بن رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس نظام تعلیم کی حامل اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل لوگ اس وقت اس بدقسمت ملک کے حکمران ہیں اور ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے ان کی کارگردگی کھلے آنکھوں دیکھ رہے ہیں بلکہ اسے بھگت رہے ہیں۔ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مرتب کردہ نیو ورلڈ آرڈر کو آگے بڑھانے کی شرط پر اپنے اپنے عہدوں پر قائم

ہیں۔ان سے یا ان جیسے دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں سے نفاذ اسلام کی توقع کرنا ایسے ہی ہے جیسے تھوہر کے پودے سے انگور کے خوشوں کی آرزو کرنا۔انہوں نے معاشرے میں دینی مدارس کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ دینی اداروں کی وجہ سے عالمی طاغوتی سازشوں اور کوششوں کے باوجود اب بھی ملک کی بڑی بھاری اکثریت دینی اقدار سے جذباتی وابستگی رکھتی ہے اور وقت آنے پر جان تک کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی۔اس لحاظ سے دینی مدارس اسلام کے قلعے ہیں جن سے ہدایت کی روشنی پھیلتی اور ظلمت دم توڑتی ہے۔دینی مدرسوں کا یہ کردار ابلیسی قوتوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور وہ عالم اسلام میں اپنے گماشتوں کے ذریعے سے انہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔انہوں نے کہا کہ آنے والا دور اسلام کا دور ہے اور اسلامی انقلاب بہر حال آئے گا جسے کوئی روک نہیں سکتا اور ان شاءاللہ یہی دینی مدارس اس کا ہراول دستہ ہوں گے۔جسٹس تارڑ نے اس بات پر زور دیا کہ دینی وعصری تعلیم کی یکجائی کو فروغ دیا جائے اور اس مقصد کے لیے کام کرنے والے اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

خیر مقدمی کلمات

—— محمد عمار خان ناصر ——
[ڈپٹی ڈائریکٹر، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ]

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم ،اما بعد!

معزز مہمانان گرامی وشرکائے محفل!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہمارے ملک میں دینی اور دنیاوی تعلیم کے جو دو نظام اس وقت رائج ہیں، ان کے بارے میں یہ بات اب مانی جا چکی ہے کہ وہ قومی سطح پر ہماری فکری، علمی، دینی اور دنیاوی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

عصری تعلیم کی درس گاہوں میں جو نظام رائج ہے، اس کی بنیاد پچھلی صدی میں برصغیر کے انگریز حکمرانوں نے رکھی تھی۔ اس کی لادینی حقیقت اور اس کے پیش نظر استعماری مقاصد خود اس کے بنانے والوں نے واضح کر دیے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس قوم کو اس کی دینی بنیاد، علمی وفکری ورثے، اخلاقی اقدار اور تہذیب ومعاشرت سے لاتعلق کر کے اس پر فرنگی فکر وتہذیب کی غلامی مسلط کر دی جائے۔ چنانچہ اہل نظر کی حقیقت شناس نگاہوں نے اسی وقت یہ محسوس کر لیا تھا کہ اہل کلیسا کا یہ نظام تعلیم:

ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

اہل فکر ودانش کی بحثوں کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو اس نظام کے تین بنیادی نقائص

سامنے آتے ہیں:

پہلا یہ کہ یہ ایک خالص مادہ پرستانہ نظام تعلیم ہے جو اپنے طالب علموں کے ذہنوں میں ملحدانہ افکار ونظریات کی آبیاری کرتا اور ان کے خیالات کی اس طرح سے تشکیل کرتا ہے کہ وہ اگر خدا اور مذہب کا زبان سے انکار نہ بھی کر سکیں تو اپنی زندگی کے شب و روز میں انہیں کہیں کوئی جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسلامیات کی تعلیم جس مقدار اور جس انداز میں اس میں شامل کی گئی ہے، اس کی حیثیت ایک پیوند کی ہے جس سے طلبہ کے فکر و ذہن کو مسلمان بنانے اور انہیں دینی حقائق سے روشناس کرانے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

دوسرا یہ اس نظام میں اردو اور انگریزی ذریعہ تعلیم کی تفریق، معاشرے کے مختلف طبقات کے لیے تعلیم، معیار اور ماحول کے لحاظ سے مختلف تعلیمی اداروں کے قیام اور اس طرح کے دوسرے اقدامات کے ذریعے سے ملت کے افراد کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور ان کی سوچ، کردار، معاشرت اور اقدار میں اس قدر بعد و تضاد پیدا کر دیا گیا ہے کہ جس کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ''ملت واحدہ'' کے افراد بن کر رہ سکیں گے۔

تیسرا یہ کہ اس میں طلبہ کے اخلاق و کردار کی تہذیب اور ان کی تربیت کا سرے سے کوئی اہتمام نہیں۔ استاد یہاں محض انتقال علم کا ایک ذریعہ ہے۔ طلبہ اس کی سیرت اور کردار میں اپنے لیے کوئی نمونہ نہیں پاتے اور نہ یہاں ان بنیادوں ہی کا وجود ہے جن پر استاد اور شاگرد کے مابین شفقت اور احترام کا تعلق استوار ہو سکتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ رائج عصری نظام تعلیم افراد ملت کی تباہی اور ان کی علمی و اخلاقی پستی میں اضافہ کے سوا کوئی کردار ادا نہیں کر رہا۔

دوسری طرف دینی مدارس جس تعلیمی نظام کے تحت کام کر رہے ہیں، اس کے ذریعے سے قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ دینی علوم کی تعلیم کا کام اگرچہ ایک حد تک انجام پا رہا ہے، لیکن انگریزی زبان اور عصری علوم سے لاتعلقی اور غلط تعلیمی ترجیحات کی بنا پر ان کا دائرۂ اثر نہایت محدود ہے اور یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ عصر حاضر کے علمی و عملی تقاضوں سے بالکل بے

خبر اپنی ہی دنیا میں مگن ہیں، چنانچہ جدید عقلی دور میں دین کی تفہیم اور اس کے مطابق ایک نظریاتی اسلامی مملکت کی تشکیل میں یہ مدارس کوئی موثر کردار ادا نہیں کر رہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اس صورت حال کی اصلاح کے لیے مختلف حکومتوں کی طرف سے کاغذی سطح پر اگرچہ متعدد بار پیش رفت ہوئی ہے لیکن عملی طور پر کسی بہتری اور اصلاح کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے، چنانچہ ایک عرصہ سے اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ سرکاری سطح پر تعلیمی اصلاحات کے لیے جدوجہد کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سطح پر پورے ملک میں ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جہاں طلبہ کو ان کی دینی وعصری ضروریات پر محیط معیاری تعلیم مہیا کی جائے اور ان کے اخلاق وکردار کی بھی بہتر تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں اہل درد اپنے اپنے دائروں میں دینی وعصری تعلیم اور فکری واخلاقی تربیت کے امتزاج کی بنیاد پر تعلیمی جدوجہد میں مصروف ہیں اور گوجرانوالہ میں شاہ ولی اللہ یونیورسٹی، الشریعہ اکادمی اور الشریعہ پبلک اسکول کا قیام بھی انہی عزائم کا آئینہ دار ہے۔

اس کے ساتھ اس امر کی ضرورت بھی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے کہ اس رخ پر کام کرنے والے اداروں اور شخصیات کے درمیان مفاہمت ومشاورت کا بھی وقتاً فوقتاً اہتمام ہوتا کہ ان مساعی کو زیادہ مفید اور بارآور بنایا جا سکے۔ گزشتہ سال اس غرض کے لیے الشریعہ اکادمی کے تحت شاہ ولی اللہ یونیورسٹی میں تعلیمی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا اور اب آپ بزرگوں کو دوسری سالانہ الشریعہ تعلیمی کانفرنس میں شرکت کی زحمت دی گئی ہے جس کا عنوان ''خواندگی، تعلیم اور دینی اقدار کا فروغ'' تجویز کیا گیا ہے۔ ہم آپ سب حضرات اور مہمانان گرامی کا خیر مقدم کرتے ہوئے تشریف آوری پر آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اس تعلیمی جدوجہد میں راہنمائی، مشاورت، تعاون اور خصوصی دعاؤں کے خواستگار ہیں۔

شرح خواندگی میں اضافہ اور دینی مراکز

—— پروفیسر غلام رسول عدیم ——
[سابق استاذ، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، گوجرانوالہ]

صدر گرامی قدر اور سامعین کرام!

علم و تعلیم کی فضیلت اور اہمیت کے بارے میں کسی دور میں بھی دو رائیں نہیں رہیں۔ جب سے انسان نے شعور کی آنکھ کھولی ہے، انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی دوائر میں بھی تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رہا ہے۔

قرآنی مضامین میں علم اور اہل علم کی قدر افزائی خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ قرآن اہل علم کو رفیع الدرجات قرار دیتا ہے: 'یرفع اللہ الذین آمنوا منکم والذین اوتو العلم درجات'۔ "اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جن کو علم عطا کیا گیا، بلند درجوں پر فائز کرے گا۔" (المجادلہ ۱۱)

قرآن استفہام انکاری کے انداز میں استفسار کرتا ہے: 'ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون'۔ "کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ لوگ جن کے پاس علم نہیں ہے، برابر ہو سکتے ہیں؟" (الزمر ۹)

سب سے بڑھ کر یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان فیض ترجمان سے جو دعائیں ادا کرائی گئیں، پورے قرآن میں کسی ایک میں بھی بجز علم کے اضافہ و زیادت کے الفاظ نہیں ملتے۔

صرف علم ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے لیے کہلوایا گیا: 'قل رب زدنی علما' ۔ ''کہو کہ اے میرے رب! مجھے مزید علم عطا فرما'' (طٰہٰ۱۱۴)

اگر فرمودات رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نظر جائزہ لیں تو تعلیم وتعلم سے متعلق ہمیں بیش قیمت جواہر ریزے ملتے ہیں۔ طلب علم کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے: 'من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتیٰ یرجع' ۔ ''جو شخص علم کی تلاش میں نکلا، وہ اللہ کے راستے میں ہے یہاں تک کہ واپس آجائے۔'' (ترمذی جلد۲ص۹۳)

بمقابلہ عابد ایک عالم کی شان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: 'فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم' ۔ ''عالم کی فضیلت عابد پر ایسے ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر'' (ترمذی جلد۲ص۹۸)

علم کی کمی کو آثار قیامت میں سے قرار دیا گیا: 'ان من اشراط الساعة ان یقل العلم' ۔ (بخاری جلد۱ص۱۸)

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور امی ہونا آپ کا طرہ امتیاز تھا، تاہم آپ نے علم وتعلیم کے ساتھ ساتھ تحریر وکتابت کی بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔ بروایت ابی ہریرہؓ جب ایک صحابیؓ رسولؐ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطبہ لکھوانے کی درخواست کی تو فرمایا: 'اکتبوا لابی شاہ' (ابوشاہ کو لکھ دو)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے عبداللہ بن عمروؓ کی برتری کو تحریر ہی کی وجہ سے فانہ یکتب و لا اکتب ''وہ لکھتے تھے اور میں لکھتا نہیں ہوں'' (بخاری ص۲۲) کہہ کر تسلیم کیا۔

صدر گرامی مرتبت!

یہ حقائق جو قرآن وحدیث کی روشنی میں علم وضبط علم سے متعلق آپ کے سامنے رکھے گئے ہیں، اسلام کی علمی اساس اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔ آج ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ علمی جلالتوں اور فنی کمالات کا دور ہے۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں جو علوم وفنون پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں، ان کا ایک اجمالی جائزہ بتاتا ہے

کہ کچھ علوم طبیعی: فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، فلکیات، جغرافیہ، علم الارض اور ان کی ان گنت شاخیں ہیں۔ دوسری طرف علوم معاشرت جیسے اقتصادیات، سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ، نفسیات، انسانیات اور ان کی بہت سی شاخیں ہیں۔ علوم السنہ دنیا بھر کی ہزاروں زبانوں کے بڑے بڑے آٹھ خاندانوں کو محیط ہیں اور پھر ان کے علوم آلیہ (Instrumental learnings) الگ اپنی حیثیت رکھتے ہیں۔ دینی علوم جو اسلام، یہودیت، نصرانیت جیسے الہامی اور ہندوٗمت، بدھ مت، جین مت، زردشتی مذاہب اور تاؤازم جیسے غیر الہامی مذاہب پر مشتمل ہیں، مستقلاً فکری دھاروں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ ان پر مستزاد جدید ٹیکنالوجی کے معرکے جس نے مادے کو تبدلات کی بھٹی سے گزار کر انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ جوہری توانائی اور الیکٹرانک کی نادرہ کاریوں نے تو محیر العقول معجزے کر دکھائے ہیں۔ لیکن حضرات! یہ تصویر کا ایک رخ ہے جو بظاہر بڑا دل آویز ہے مگر ہم ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں ایک طرف تو ابن آدم علم وحکمت اور دانش و بینش کے فلک الافلاک کو چھو رہا ہے، دوسری طرف اسی بنی نوع انسان کا ایک بہت بڑا طبقہ علمی وجاہت تو کیا معمولی نوشت وخواند سے بھی محروم ہے۔ ایسی بلندی، ایسی پستی! العجب ثم العجب ثم العجب!!!

آج کی نشست میں ہم اسی ہولناک خلا کی نشان دہی کر کے پاکستانی معاشرے میں دینی مراکز کے حوالے سے چند تجاویز سامنے لائیں گے۔

صدر والا قدر!

مجھے اجازت دیجیے کہ میں خواندگی کے بارے میں بھی کچھ عرض کرتا چلوں۔ خواندگی کا لفظ بظاہر محض پڑھنے کے معنی دیتا ہے۔ تاہم اس کا انگریزی متبادل لفظ Literacy ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے لاطینی Littera (انگریزی Letter) یعنی حروف تہجی سے ماخوذ ہے۔ یوں Literacy کے معنی بھی حرف شناسی کے ہیں۔ تاہم دور حاضر میں خواندگی یا Literacy محض پڑھنے تک ہی محدود نہیں رہی، اس میں لکھنا اور حساب کرنا بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر انسائیکلوپیڈیا امریکانا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

Literacy is the ability to read and write. This ability or lack

of it, illiteracy, can be defined in several ways. People can be called literate if they can read a few lines and sign their names. Many authorities feel that more realistic criterion involves writing useful letters, reading meterials such as newspapers and dealing with business firms .... that is being functionally literate. Reducing illiteracy is one of the major tasks of education around the world.

معلوم ہوا کہ تعلیم (Education) کا ایک بہت بڑا کام ناخواندگی کو دور کرنا بھی ہے۔

حضرات! ناخواندگی کو دور کرنے کے ڈانڈے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ فرخ فال سے جا ملتے ہیں۔ امام بخاریؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب صحیح بخاری جلد اول کے ص ۷ پر 'تفقهوا قبل ان تسودوا' والی حدیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: قال ابو عبد اللہ قد تعلم اصحاب النبی بعد کبر سنھم۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنی عمر رسیدگی میں، جب جسمانی قویٰ بہت حد تک مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں، وہ علمی شکوہ تو حاصل نہیں کر سکتا جو اوائل عمر سے حصول علم کے لیے کوشش کرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یوں امام بخاریؒ کے اس قول سے خواندگی اور بالخصوص تعلیم بالغاں کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے۔

حضرات! جہاں تک پاکستان کے تعلیمی مسائل کا تعلق ہے، ان کا تفصیلی تذکرہ اس مقالے کے موضوع سے خارج ہے۔ وہ تعلیم نسواں کا مسئلہ ہو یا پیشہ ورانہ اخلاق کا، طلبہ میں ضبط و نظم کے فقدان کا مسئلہ ہو یا معیار تعلیم کے انحطاط کا، تعلیم میں یکساں مواقع کی عدم فراہمی کا مسئلہ ہو یا تعلیم اور روزگار میں عدم توازن کا، وہ ترک تعلیم کے وجوہ ہوں یا ناخواندگی یا خواندگی میں کمی کا مسئلہ، ماہرین تعلیم میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ خواندگی کا مسئلہ سب سے زیادہ گھمبیر بھی ہے اور سنگین بھی۔ پاکستان میں خواندگی کی شرح حیرت ناک ہی نہیں، اندوہ ناک حد تک کم ہے۔

ایک نظر ان اعداد و شواہد پر ڈالیے تو حقائق اظہر من الشمس ہو جائیں گے:

سال	شرح خواندگی
۱۹۴۷ء	۱۵٪ (قیام پاکستان کے وقت)

۱۹۵۱ء	۱۶ء۴٪
۱۹۶۱ء	۱۳ء۶٪
۱۹۷۲ء	۲۱ء۷٪
۱۹۸۱ء	۲۶ء۲٪ (مردوں میں ۳۵ء۱٪، عورتوں میں ۱۶ء۱٪)

اگر پاکستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں کا شرح خواندگی کے اعتبار سے موازنہ کیا جائے تو اندیشہ ناک حقائق سامنے آتے ہیں۔ صرف ایک سال ۱۹۸۸ء کے اعداد و شمار ملاحظہ کیجیے۔ پاکستان ۳۰٪ (ساتویں منصوبے کے تحت) یعنی ۷۰٪ عوام ناخواندہ ہیں قومی ترقی میں کیا حصہ لے سکیں گے۔

بنگلہ دیش	۳۳ء۱٪	سری لنکا	۸۷ء۱٪
ایران	۵۰ء۸٪	انڈونیشیا	۴۷ء۰۰٪
جاپان	۹۹ء۳٪	بھارت	۴۳ء۵٪
عوامی کوریا	۹۳ء۰۰٪	ترکی	۷۴ء۲٪
تھائی لینڈ	۹۱ء۰۰٪	فلپائن	۸۵ء۴٪

یہ صرف ایشیائی ممالک میں سے بعض کی جھلک ہے، مغربی دنیا سے اس سلسلے میں مقابلہ ہی نہیں۔

حضرات! اگر خواندگی میں کمی کے وجوہ کا جائزہ لیا جائے تو کئی اسباب سامنے آئیں گے جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ آبادی میں روز بروز اضافہ: پاکستان کی آبادی ۳٪ سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے یعنی ۳۵ لاکھ بچوں کے لیے سالانہ تعلیمی سہولتیں مطلوب ہوتی ہیں۔ آبادی میں تو اضافہ ہو رہا ہے اور اسکولوں کی تعداد میں اس شرح سے اضافہ نہیں ہو رہا۔

۲۔ تعلیم پر خرچ: یونیسکو (UNESCO) کی سفارش کے مطابق ترقی پذیر ممالک کو مجموعی قومی آمدنی کا کم از کم ۴٪ تعلیم پر خرچ کرنا چاہیے جبکہ پاکستان صرف ۲٪ خرچ کرتا ہے۔

۳۔تعلیم کی اہمیت: چونکہ کثیر تعداد ناخواندہ افراد پر مشتمل ہے، اس لیے وہ تعلیم کی اہمیت ہی کو نہیں سمجھتے۔

۴۔پرائمری سکولوں میں داخلہ: پاکستان میں ۵ سال سے ۱۰ سال کی عمر کے بچوں کی تعداد کا صرف ۴۵٪ حصہ سکولوں میں داخلہ لے پاتا ہے۔اس میں بھی ۶۶٪ لڑکوں اور ۳۳٪ لڑکیوں کو داخلہ ملتا ہے۔

۵۔ترک تعلیم: ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے مطابق ۴۶ء٪ بچے سکولوں میں داخلہ لیتے ہیں۔باقی ۳۶ء٪ پرائمری پاس کر کے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔

۶۔معاشی مجبوریاں: غریب والدین بالکل چھوٹی عمر میں بچوں کو کام پر لگا دیتے ہیں۔وہ تعلیم سے یکسر محروم رہ کر ناخواندگی میں اضافے کا موجب بنتے ہیں۔

۷۔ناقص منصوبہ بندی: تعلیم عام کے حکومتی منصوبوں میں انتظامی اور ناقص منصوبہ کے بڑے بڑے خلا ہیں۔

حکومت نے بلاشبہ کسی حد تک خواندگی کی شرح بڑھانے کی طرف پیش رفت کی ہے مگر تاحال مقاصد حاصل نہیں ہوسکے۔ سہ پہری اسکول، کچی آبادی پراجیکٹ، رضا کار معلم پراجیکٹ، مسجد اسکول، محلّہ اسکول، نئی روشنی اسکول، سپاہ تدریس پراجیکٹ جیسے منصوبے زیر عمل آئے مگر نتائج کچھ نہیں نکلے۔اسکولوں اور کالجوں میں بھی میٹرک، ایف اے اور بی اے کے طلبہ میں خاص منصوبے کے تحت یہ مہم چلائی گئی مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ دینی مراکز اس سمت میں کیا رول ادا کر سکتے ہیں۔

حضرات! یہ بات تو آپ حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ قرآن مجید کا آغاز نزول ہی لفظ 'اقرا' سے ہوتا ہے اور ن والقلم میں قلم کی عظمت کا اعتراف قسم کے لہجے میں صاف نظر آتا ہے۔ جہاں دینی مراکز کا فریضہ تہذیبی و تمدنی اقدار کا فروغ ہے، جہاں ان کا کام ہے کہ وہ اسلامی تراث کا احیا کریں، وہاں ان پر بہت بڑی ذمہ داری یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش میں ناخواندگی کا قلع قمع کر کے پورے ماحول کو علم و دانش اور تفقہ فی الدین کے نور سے جگمگا دیں۔ یہ

مراکز منارہ ہائے نور ہیں، مگر کتنی الم انگیز صورت حال ہے کہ انہی کے سائے میں نوشت وخوانداور حرف شناسی سے بے بہرہ محروم القسمت بھی موجود ہیں۔

میری رائے میں:

(۱) دینی مراکز کے اساتذہ جو علم وفضل کے کوہ ہائے گراں ہیں، اپنے طلبہ میں خواندگی کی اہمیت اجاگر کریں۔ وہ ان کے ذہن میں یہ نقش مرتسم کر دیں کہ وہ خود تو دینی علوم کے حصول کے لیے شبانہ روز محنت میں سرگرم عمل رہتے ہیں، انہیں ان پڑھ لوگوں کی بھی خبر لینا چاہیے کیونکہ ایسے لوگ دینی فرائض کو بوجوہ احسن ادا نہیں کر سکیں گے۔ یوں طلبہ میں ذہنی طور پر ایک مثبت فکر اور دلی طور پر ایک داعیہ پیدا کر دیا جائے کہ وہ اس میدان میں ناخواندگی اور جہالت کے خلاف سپاہی بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔

(۲) دینی درس گاہیں ناخواندگی کے ازالے کے لیے جو اہم کام کر سکتی ہیں، وہ یہ کہ عامۃ الناس میں نوشت وخواند کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کلاسوں کا اہتمام کریں۔ دینی مدارس کے طلبہ اپنی تعلیم سے کچھ وقت نکال کر ان ناخواندہ لوگوں کو تعلیم دیں۔ اپنے ٹائم ٹیبل میں اس کار خیر کے لیے گنجائش پیدا کریں۔

(۳) ہر طالب علم اپنی نجی حیثیت میں Each one teach one (ایک پڑھائے ایک) کے Slogan کے ساتھ ایک سال میں کم از کم ایک ناخواندہ فرد کو خواندگی کی حد تک باصلاحیت کردے۔ وہ ناخواندہ افراد کو باور کرادیں کہ نعم الا ثنین اذا خلوت کتاب۔

(۴) تشویق وترغیب میں قدرے اجباری پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے دینی مراکز کے مہتمم حضرات کسی طالب علم کو سند فراغ اس وقت جاری کریں جب وہ یہ ثابت کر دے کہ اس نے دوران سال میں کم از کم ایک ناخواندہ شخص کو پڑھنے لکھنے کے قابل بنا دیا ہے۔

(۵) دینی درس گاہوں کے طالب علم کچھ وقت کے لیے معاشرے کے مختلف طبقوں سے ارتباط پیدا کریں اور ناخواندہ افراد کو تلاش کر کے ان کو تعلیم دیں۔ اس تجویز سے دوہرے فائدے کا حصول ممکن ہے۔ جب وہ اپنے مخصوص اور محدود ماحول سے نکل کر خواندگی کے مراکز قائم کریں

گے تو ایک تو وہ خواندگی میں اضافہ کر رہے ہوں گے، دوسرے اپنے زیر اثر افراد میں اپنے نقطہ نگاہ کا پرچار کر رہے ہوں گے۔ یوں تبلیغ و دعوت کا فریضہ بھی انجام پذیر ہوگا۔ اس ارتباط واختلاط سے ایک اور فائدے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ دینی درس گاہوں کے طلبہ جو کئی سال دینی مراکز میں ہی گزار کر باہر نکلتے ہیں تو معاشرے میں اپنے آپ کو Unfit نہ سہی، Misfit ضرور پاتے ہیں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ انہی لوگوں میں کامیاب زندگی گزار سکیں گے جن کی انہیں مستقبل میں راہنمائی کرنا ہے۔

(۶) حکومت نے بھی ناخواندگی کے خلاف کچھ منصوبے شروع کر رکھے ہیں مگر وہ انتظامی کمزوریوں اور روایتی حکومتی التوائی حیلوں کی نذر ہو رہے ہیں۔ اگر دینی مراکز کے اہل حل وعقد اس طرف توجہ فرمائیں تو ان حکومتی منصوبوں میں ہاتھ بٹا کر انہیں فعال بنا سکتے ہیں۔ دینی مراکز کے ارباب بست وکشاد اگر اپنے اندر قدرے لچک پیدا کر لیں تو ان کے پاس جو سرمایہ ہے یعنی ان کے طالب علم، قوم وملک کا سرمایہ افتخار بن سکتے ہیں۔

(۷) حکومت اور فلاحی ادارے بھی اس سمت میں اگر ان طلبہ کی خدمات لینا چاہیں تو وہ ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے لیے وہ انہیں فنڈ مہیا کر سکتے ہیں۔ اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر دینی مراکز کے انتظامی، علمی، تعلیمی، تدریسی اور فکری پروگرام میں دخیل ہوئے بغیر وہ ان سے کام لے سکتے ہیں اور یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جس تڑپ، لگن اور خلوص نیت سے دینی مراکز کے خدا ترس اور تقویٰ شعار لوگ اس صلاحی وفلاحی کام میں حصہ لیں گے، دوسرے لوگ نہیں لے سکتے۔

حضرات! حرف آخر کے طور پر عرض کروں گا کہ اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے یا ان کو زیر بحث لا کر مزید رائے زنی کر کے کوئی ٹھوس لائحہ عمل اختیار کر لیا جائے تو پاکستان میں افسوس ناک شرح خواندگی میں حوصلہ افزا حد تک اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے فروغ میں الیکٹرانک میڈیا کا کردار

ـــ محمد شکور طاہر ـــ
[سابق ڈائریکٹر نیوز، پی ٹی وی، اسلام آباد]

جس طرح انسان اور انسانی معاشرے کی بقا اپنی ذات اور دوسروں پر ظلم سے احتراز، قوانین فطرت کی پابندی اور عدل وانصاف، توازن اور اعتدال کے اصولوں پر کار بند رہنے میں ہے، اسی طرح فرد اور معاشرے کے ارتقا، نشو ونما اور تعمیر وترقی کا انحصار بنیادی طور پر علم، معلومات واطلاعات اور سوچ بچار کی صلاحیت اور پھر اس علم اور صلاحیت کو بروئے کار لانے پر ہے۔ جس طرح ظلم تخریب، انتشار، انحطاط اور اکائیوں، اداروں اور اقدار کی ٹوٹ پھوٹ اور بربادی کا باعث ہے، اس طرح جہالت پس ماندگی، تنزل، ذہنی افلاس اور قوت عمل سے محرومی کی بڑی وجہ ہے۔ دین فطرت اسلام نے انسان اور انسانی معاشرے کی بقا اور ترقی کے لیے ظلم اور جہالت کے خاتمے اور عدل وانصاف اور علم کے فروغ پر زور دیا ہے تا کہ انسان اپنی ذات اور اپنے اردگرد پھیلی ہوئی کائنات میں قدرت کی نشانیوں اور مظاہر فطرت پر غور وفکر کر کے حقیقی کامیابی، حق وصداقت اور اپنی بھلائی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ طلب علم کو فریضہ بھی قرار دیا گیا، مہد سے لحد تک تعلیم کی اہمیت بھی اجاگر کی گئی اور حصول علم کے شوق کو فراواں کرنے کے لیے یہ بھی تلقین کی گئی کہ اگر علم کی خاطر چین جیسے دور افتادہ دیار غیر تک بھی جانا پڑے تو گریز نہ کیا جائے اور غریب الوطنی اور سفر کی مشقت برداشت کر کے بھی تعلیم حاصل کی جائے۔

درحقیقت علم دو ہیں: علم الادیان اور علم الابدان۔

پہلا علم اس لامتناہی کائنات میں انسان کی اپنی حیثیت کے ادراک اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق اور رشتے کے شعور کا نام ہے، اور دوسرا علم انسان کا اپنی ذات کی مختلف پرتوں اور دوسری جاندار اور نامیاتی اور غیر نامیاتی اشیا کے حقائق، کیفیات اور اثرات کو جاننا اور ان دونوں کے باہمی تعامل کی حقیقت کو سمجھنا ہے تاکہ جب وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول پر پہلے علم کا عملی اطلاق کرے تو اسے کسی بھی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے، بلکہ زندگی اس کے لیے سہل اور آسودہ ہو جائے۔ علم کی باقی شاخیں، شعبے اور مضامین، خواہ آپ انہیں فنون اور سائنس کا نام دیں یا انہیں عمرانی (social) اور طبعی علوم کے خانوں میں بانٹ دیں، انہی دو بنیادی علوم کے خادم ہیں تاکہ ان کی معاونت سے ان بنیادی علوم کے اسرار و رموز اور کمالات تک رسائی ہو سکے۔

حصول علم کا پہلا زینہ خواندگی ہے، وہی کلیدی لفظ (key word) 'اقـرا' جو خدا کے آخری پیغام کا نقطہ آغاز ہے۔ اس وقت خواندگی سے عمومی مراد یہ لی جاتی ہے کہ انسان میں لکھنے پڑھنے کی تھوڑی بہت صلاحیت پیدا ہو جائے۔ تاہم اب ماہرین خواندگی کی تعریف نئے سرے سے متعین کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چند الفاظ یا جملے پڑھ لینا اور چند حرف لکھ لینا خواندہ ہونے کے لیے کافی نہیں۔ ان کے نزدیک خواندگی کا بنیادی عنصر (thoughtfulness) ہے، یعنی انسان کسی بھی معاملے پر غور و فکر کر کے اپنے مسائل کا تجزیہ کر سکے اور اس تجزیے کی روشنی میں ان مسائل کے حل تک پہنچ سکے۔ گویا وہی چیز جسے ہمارے دین نے تفکر اور تدبر کا نام دیا ہے، تفکر، تدبر اور سوچ بچار اور غور و فکر کی یہ صلاحیت تعلیم سے ہی جلا پاتی ہے۔

تعلیم کا ایک انداز بلاواسطہ یا براہ راست (direct) ہے، یعنی سیدھے سبھاؤ کوئی کتاب یا مضمون پڑھایا جائے یا سبق دیا جائے۔ اس میں ایک رکھ رکھاؤ اور کسی حد تک تکلف کا ماحول ہوتا ہے اور پڑھنے والے اور پڑھانے والے میں شاگرد اور استاد کا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن تعلیم کا ایک دوسرا انداز یا طریقہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ کتاب پڑھا کر جو چیزیں ذہن نشین کرانا تھیں یا سبق کے ذریعے جو باتیں سمجھانا مقصود تھیں، وہی باتیں درسی ماحول کی بجائے بے تکلف دوستانہ ماحول میں،

عام گفتگو اور بات چیت کے انداز میں، اشارے کنایے میں، ضرب الامثال اور حکایات کے سہارے، شعروشاعری کے لطیف اسلوب سے، یا تمثیل کے پیرایے میں واضح کردی جائیں۔ اسی طرح عقل کی وہی بات جو کتاب یا درس کے ذریعے بتانا مقصود تھی، ہلکے پھلکے انداز میں مخاطب کے ذہن پر نقش کردی جاتی ہے تاکہ وہ آئندہ زندگی میں اس سے کام لے سکے۔ تعلیم کا یہ بالواسطہ (indirect) انداز ہے۔ اطلاعات اور معلومات کی فراہمی اس بالواسطہ تعلیم کا سب سے اہم پہلو ہے کیونکہ روزمرہ کی یہی معلومات اور اطلاعات علم میں بتدریج اضافے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلیم کی یہ بات تو علم سکھانے اور معلومات بہم پہنچانے کے طریقے اور انداز کے حوالے سے تھی۔ فروغ تعلیم کا ایک حوالہ ذرائع تعلیم کا بھی ہے۔ اس حوالے سے ذرائع تعلیم کو منضبط اور غیر منضبط یا رسمی (formal) اور غیر رسمی (non-formal) دو شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسکول، کالج، مکاتب اور مدارس رسمی ذرائع تعلیم ہیں اور دوسرے سمعی، بصری اور معاون ذرائع جو باضابطہ نظام تعلیم کے دائرے سے باہر ہوں، غیر رسمی ذرائع میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ذرائع تعلیم کی یہ تقسیم اتنی جامد یا غیر لچک دار نہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لیے دو جدا جدا خانوں میں مقید کیا جا سکے۔ ایک واضح فرق کے باوجود دونوں شعبوں کے ذرائع میں انتہائی قریبی رابطہ، ہم آہنگی اور اشتراک وتعاون ہے، اور غیر رسمی ذرائع، رسمی ذرائع کی تکمیل، ان کے پیغام کی ترویج اور مقاصد کی تحصیل کا باعث ہیں۔

آج تعلیم اور خواندگی کے لحاظ سے وطن عزیز کی جو حالت اور مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تمام تر کوششوں اور بلند بانگ دعووں کے باوجود ہمارے ملک کا شمار پس ماندہ ممالک میں ہوتا ہے اور تعلیم اور خواندگی کے لحاظ سے کئی ترقی پذیر قومیں بھی ہم سے بہت آگے ہیں۔ اس پس ماندگی کی وجوہ کئی ایک ہیں، لیکن ایک بڑی وجہ جدید ذرائع، وسائل اور طریقوں سے ناواقفیت اور ان کی کم یابی یا عدم استعمال بھی ہے۔

عہد حاضر کو ذرائع ابلاغ یا میڈیا کا دور کہا جاتا ہے اور بجا طور پر کہا جاتا ہے کیونکہ ان ذرائع

ابلاغ نے پوری دنیا کو سمیٹ کر یا آپس میں مربوط کر کے ایک گاؤں بنا دیا ہے جہاں ہر گھرانہ اور ہر گھرانے کا ہر فرد، دوسرے گھرانوں اور ان کے افراد کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور جو کچھ نہیں جانتا، اسے جاننے کا ہر وقت خواہش مند رہتا ہے۔ ان ذرائع ابلاغ میں الیکٹرانک میڈیا (electronic media) یعنی ریڈیو، ٹیلی ویژن، نشریاتی سیارے یا سیٹلائٹ، کمپیوٹر اور ان کے ہم قبیل ذرائع اور ان کے انصار واعوان شامل ہیں۔

ریڈیو (Radio)

ریڈیو کو صوتی یا سمعی ذریعہ ابلاغ کہا جاتا ہے جو آواز کے جادو سے سننے والے مسحور کرتا ہے۔ اس صدی کے تیسرے عشرے میں الیکٹرانک میڈیا کا باقاعدہ آغاز ریڈیو نشریات سے ہوا تو کم و بیش ہر ملک میں ریڈیائی لہروں کے ذریعے پیغام کی ترسیل کے تین اساسی مقاصد قرار پائے: اطلاعات، تعلیم اور تفریح۔ ان میں سے پہلے دونوں مقاصد باہم منسلک اور مربوط ہیں۔ اطلاعات اور معلومات اگر تعلیم کی روح نہیں تو اس کے اعضا اور جوارح اور ممد و معاون ضرور ہیں۔ تعلیم کے لیے روزمرہ اطلاعات اور معلومات کی حیثیت وہی ہے جو انسان کے جسمانی نظام کے لیے لحمیات، معدنیات، حیاتین اور دوسرے قوت بخش اجزا کی ہے۔ درحقیقت اطلاعات اور معلومات بالواسطہ غیر رسمی تعلیم کا سب سے اہم اور موثر ذریعہ ہیں۔

دوسرے ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی ریڈیو کا تنظیمی ڈھانچہ قائم ہونے کے کچھ عرصے بعد باضابطہ تعلیمی پروگرام شروع کر دیے گئے تھے۔ اس وقت ریڈیو پاکستان کے مختلف مراکز سے خالص تعلیمی پروگراموں کے علاوہ ایسے بالواسطہ پروگرام بھی پیش کیے جا رہے ہیں جن سے مختلف سماجی اور قومی مسائل کے بارے میں شعور بیدار اور احساس اجاگر ہو۔

ریڈیو کا دائرہ اثر اتنا وسیع ہے کہ اس دور میں کم ہی گھرانے ایسے ہوں گے جہاں ریڈیو نہ ہو۔ شہروں ہی میں نہیں، دیہات میں بھی ریڈیو عام ہے۔ اس عمومی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قیمت کے لحاظ سے ریڈیو دوسرے ذرائع ابلاغ سے کہیں سستا ہے۔ پھر اس کے لیے بجلی کی محتاجی بھی نہیں، بیٹری کے سیل (cell) ڈالیں اور ریڈیو چلا لیں۔ ٹیلی ویژن کی طرح ریڈیو سننے کے لیے

کہیں بندھ کر بیٹھنا نہیں پڑتا۔ چھوٹا سا ٹرانزسٹر جیب میں ڈالیں اور کہیں بھی چلے جائیں۔ وقت اور مصروفیات کی کوئی بندش نہیں۔ کسی بھی کام میں مصروف ہوں، ریڈیو کی آواز کان میں آتی رہتی ہے اور ذہن پر اپنے نقش چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ریڈیو کو موثر اور ہمہ گیر ذریعہ ابلاغ قرار دیا گیا ہے۔

آڈیو کیسٹ (Audio Cassette)

آڈیو کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈر بھی صوتی یا سمعی ذریعہ ابلاغ کا حصہ ہے۔ اثر آفرینی کے لحاظ سے آڈیو کیسٹ، ریڈیو سے کم نہیں۔ سستا اتنا کہ چند پیالی چائے اور سگریٹ نہ پیے اور کیسٹ خرید لی۔ استعمال اتنا آسان کہ بچہ بھی لگا سکے اور یہ سہولت سب سے بڑھ کر کہ آپ کچھ بھی کر رہے ہوں، کیسٹ کی آواز سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ان خوبیوں اور اثر پذیری کی وجہ سے آڈیو کیسٹ تعلیمی معاون کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ نصابی کتابوں کو سمجھنے کے لیے تشریحی لیکچر درکار ہوں تو بھی، اور اگر کوئی غیر ملکی زبان سیکھنا چاہیں تو بھی آڈیو کیسٹ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ کیسٹ اس طرح زبان سکھاتے ہیں گویا کوئی اہل زبان استاد بڑی محنت کے ساتھ اس زبان کے قواعد، صرف ونحو، تراکیب اور تلفظ سکھاتا اور لب ولہجہ سنوارتا ہو۔ یہی نہیں، آڈیو کیسٹ پر کتابیں بھی دستیاب ہیں۔ جن لوگوں کو کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں، وہ گاڑی میں آتے جاتے سن سکتے ہیں۔ یہ کتابیں کسی خاص موضوع تک محدود نہیں۔ کلاسیکی ادب ہو یا جدید فن پارے، شعری مجموعہ ہو یا نثری شاہکار، تاریخ ہو یا فلسفہ، سائنسی موضوعات ہوں یا اقتصادیات جیسا خشک مضمون، آڈیو کتابیں موجود ہیں۔

تعلیمی مقاصد کے لیے ان سمعی ذرائع کو استعمال کرتے وقت انسانی ذہن کی قوت انجذاب، دماغ کے مختلف حصوں کی ساخت اور کارکردگی اور نفسیات کے تمام متعلقہ پہلوؤں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ تعلیم سے سیکھنے کے عمل میں دماغ کا دایاں اور بایاں، دونوں حصے استعمال ہوتے ہیں۔ انسانی دماغ کا بایاں حصہ تجزیے، تحلیل، حساب کتاب اور منطقی نتائج اخذ کرنے کی فطری صلاحیت رکھتا ہے، جبکہ دایاں حصہ طبع زاد خیالات، جدت وندرت فکر،

موسیقی اور شاعری کا منبع سمجھا جاتا ہے۔ اگر دماغ کے دونوں حصوں کو اس طرح بیدار کیا جائے کہ ان کے درمیان توازن اور ہم آہنگی بھی برقرار رہے اور دونوں حصے بیک وقت سیکھنے کے عمل میں بھی شریک ہوں تو ذہن کی قوت جاذبہ بڑھ جاتی ہے، سیکھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، پڑھی یا سیکھی ہوئی بات نسبتاً زیادہ دیر تک یاد رہتی ہے اور مسائل کا تجربہ کر کے عقل و دانش کی روشنی میں ان کا حل تلاش کرنے کی صلاحیت کو نمو ملتی ہے۔ پڑھنے اور سیکھنے کے اسی عمل کو ملحوظ رکھتے ہوئے سمعی ذرائع ابلاغ کے لیے تعلیمی پروگرام یا ایسے پروگرام جن سے بالواسطہ تعلیم ملے، ترتیب دیے جاتے ہیں۔

فلم (Film)

ریڈیو کا ہم عصر ایک اور ذریعہ ابلاغ فلم ہے۔ اس خالص تفریحی ذریعے کو بھی محدود پیمانے پر اطلاعات کی فراہمی اور تعلیم کے فروغ کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرنے والی ایسی معلوماتی فلموں کو دستاویزی فلموں کا نام دیا گیا۔ دستاویزی فلمیں ہر خیال، ہر جذبے اور ہر موضوع پر مبنی ہیں اور نہایت پرکشش اور اثر انگیز ہوتی ہیں۔ جنگ کے دوران یہی فلم ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوئی اور اس کے ذریعے قومی نقطہ نظر کی ترجمانی اور دشمن کے خلاف پراپیگنڈا کیا گیا تاکہ اپنے عوام کے حوصلے بلند رہیں اور دشمن قوم کو نفسیاتی زک پہنچائی جائے۔ یہی زمانہ امن میں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ اپنی مصنوعات کی تشہیر کر کے اپنے کاروبار کو ترقی دیتے ہیں۔

خالص پراپیگنڈے اور تشہیری اور دستاویزی فلموں کے علاوہ ایسی فلمیں بھی تیار کی جاتی ہیں جن کے ذریعے طلبہ کو نصابی تعلیم یا پیشہ ورانہ تربیت دی جائے۔ یہ تعلیمی (instructional) فلمیں کلاس روم میں استاد کے لیے ایک سمعی و بصری معاون اور لیبارٹری میں گائیڈ کا کام دیتی ہیں۔ بعض صنعتی ادارے بھی اپنے کارکنوں کو ہنر سکھانے یا ان کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے تعلیمی اور دستاویزی فلموں سے کام لیتے ہیں۔

ٹیلی ویژن (Television)

ہوا کی لہروں پر ریڈیو کی اجارہ داری کو ٹیلی ویژن نے ختم کیا۔ تقریباً پچاس سال پہلے

امریکہ میں ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز ہوا۔ دیکھتے دیکھتے ہر ملک میں ٹیلی ویژن کمپنیاں قائم ہوگئیں اور اس موثر تر ذریعہ ابلاغ نے چند سال کے اندر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس ذریعہ ابلاغ کے اثر کی سب سے بڑی وجہ اس کا تصویری پہلو ہے۔ چین کی ایک قدیم کہاوت ہے کہ ایک تصویر ہزار الفاظ سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس کہاوت کی سچائی کا ثبوت ٹیلی ویژن ہے جس نے سمعی اور طباعتی ذرائع یعنی آڈیو اور پرنٹ(print) میڈیا کی قوت کو یکجا کر دیا۔

دسمبر ۱۹۶۴ء میں پاکستان میں ٹیلی ویژن نشریات کے آغاز کے کچھ عرصے بعد پاکستان ٹیلی ویژن میں تعلیمی شعبہ قائم کر دیا گیا اور براہ راست اور بالواسطہ تعلیمی پروگرام پیش کیے جانے لگے۔ تاہم ان پروگراموں کی تعداد کم اور دورانیہ (duration) محدود تھا۔ ۱۹۸۰ کے عشرے میں ٹیلی ویژن کے تعلیمی چینل پر کام شروع ہوا اور ساڑھے تین سال پہلے نومبر ۱۹۹۲ میں تقریباً تریسٹھ کروڑ روپے کی لاگت سے تعلیمی ٹیلی ویژن کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا۔ اس منصوبے کے لیے پچاس کروڑ روپے سے زیادہ رقم جاپان نے امداد کے طور پر دی تھی۔ اس منصوبے کے تحت اسلام آباد میں ایک تعلیمی ٹیلی ویژن مرکز اور ملک کے مختلف علاقوں میں سولہ چھوٹے ری براڈ کاسٹ (re-broadcast) اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں۔ پہلے مرحلہ میں ملک کے چوبیس فی صد علاقے میں چھپن فیصد آبادی یعنی ساڑھے چھ کروڑ افراد تک عام ٹیلی ویژن کے ذریعے تعلیمی نشریات پہنچتی ہیں۔ دوسرے مرحلے میں لاہور اور کراچی میں دو نئے تعلیمی ٹیلی ویژن مراکز اور اٹھائیس چھوٹے براڈ کاسٹ اسٹیشن قائم کیے جائیں گے۔ اس طرح پاکستان کے چھہتر فیصد علاقے تک عام ٹیلی ویژن سگنل کے ذریعے تعلیمی نشریات پہنچ سکیں گی جس سے ملک کی پچانوے فیصد آبادی یعنی گیارہ کروڑ اسی لاکھ افراد مستفید ہوں گے۔ نشریاتی سیارے سیٹلائٹ کے ذریعے تعلیمی نشریات اس وقت بھی پاکستان بھی کے علاوہ بتیس دوسرے ممالک کے کروڑوں افراد تک پہنچ رہی ہیں اور وہ تمام لوگ جنہوں نے ڈش(dish) لگا رکھی ہے، ان تعلیمی پروگراموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تعلیمی چینل کی نشریات روزانہ تقریباً سات گھنٹے ہوتی ہیں۔ جو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں، ان میں مختلف مدارج کے نصابی موضوعات، سائنسی تجربات، کمپیوٹر، پیشہ ورانہ تربیت، فنی مہارت اور صنعت، کاروبار اور

زراعت کے بارے میں بلاواسطہ تعلیمی پروگرام شامل ہیں۔ بالواسطہ پروگراموں میں ذہنی آزمائش کے مقابلے، مباحثے اور تقاریر اور دیگر معلوماتی اور دستاویزی پروگرام شامل ہیں۔ ٹیلی ویژن کے بعض دوسرے پروگراموں میں بھی، جو براہ راست تعلیمی افادیت نہیں رکھتے، معلوماتی پہلو ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

سمعی اور بصری ذرائع کے امتزاج اور ان کی مشترکہ قوت کا مظہر ہونے کی وجہ سے ٹیلی ویژن کی اثر آفرینی بے پناہ ہے۔ سیٹلائٹ یا نشریاتی سیاروں نے ٹیلی ویژن کی اس قوت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، لیکن اس قوت کو مفید انداز میں اور مثبت مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے تو اس کی ہلاکت آفرینی بھی بے پناہ ہے۔ یہ ایٹمی قوت کی طرح ہے جس کا قاعدے قرینے سے استعمال دنیا میں آسائشات اور خوشیوں کے پھول بھی بکھیر سکتا ہے اور بیمار انسانیت کو زندگی بھی بخش سکتا ہے، لیکن اس کا غیر ذمہ دارانہ استعمال موت کی قہر سامانی کے سوا کچھ نہیں۔ یا پھر اس کی مثال کثیر الاثر زہر جیسی ہے جسے اگر سوچ سمجھ کر طبی اصولوں کے مطابق اور حکمت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو کار تریاقی کرتا ہے اور اگر بغیر سوچے سمجھے نگل لیا جائے تو بدترین موت کا باعث بنتا ہے۔

ٹیلی ویژن کی تباہ کاریوں کی داستان صرف ہمارے معاشرے تک محدود نہیں۔ امریکہ جیسے مادر پدر آزاد معاشرے میں بھی، جہاں بہت سی اخلاقی اقدار دم توڑ چکی ہیں، لوگوں کو شکایت ہے کہ ٹیلی ویژن پروگراموں میں عریانی، فحاشی اور تشدد بہت ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک مطالعے کے نتائج منظر عام پر آئے ہیں۔ امریکہ کے تئیس ٹیلی ویژن چینلز سے بیس ہفتے کی مدت کے دوران پیش کیے جانے والے دو ہزار سات سو پروگراموں کے تجزیے سے پتہ چلا ہے کہ ستاون فی صد پروگراموں میں کسی نہ کسی حد تک تشدد کا عنصر تھا۔ ماہرین کے مطابق یہ تشدد اس طرح کا تھا جو بچوں کے ذہن پر اثر انداز ہو سکے اور انہیں بھی کسی نہ کسی صورت میں تشدد کی طرف راغب کرے۔ تاہم اب امریکی عوام نے عریانی اور تشدد کے خلاف تنقید اور شکایات کے مرحلے سے گزر کر ایک عملی قدم بھی اٹھایا ہے۔ وہاں ایک قانون منظور ہوا ہے جس کے تحت اگلے دو سال کے دوران ہر نئے ٹیلی

ویژن سیٹ میں ایک پرزہ لگا ہوگا جس کے ذریعے والدین کو ہر پروگرام کے بارے میں معلوم ہو سکے گا کہ وہ عریانی اور تشدد کے لحاظ سے کس درجے کا ہے۔ ٹیلی ویژن چینل اپنے پروگراموں کی اس طرح درجہ بندی کریں گے جس سے پتہ چل سکے کہ پروگرام میں عریانی اور تشدد کا تناسب کیا ہے۔ اس طرح والدین کو یہ فیصلہ کرنے میں سہولت ہوگی کہ وہ کس پروگرام کو اپنے بچوں تک پہنچنے دیں اور کس پروگرام سے اپنے بچوں کو محفوظ رکھیں۔ یہ پرزہ جسے وی چپ(v.chip) کا نام دیا گیا ہے، دراصل کمپیوٹر کا ایک پرزہ ہے اور یہ زیادہ مہنگا بھی نہیں۔ اس کی قیمت صرف ایک ڈالر ہوگی۔ یہ روش امریکہ سے چلی ہے تو پوری دنیا میں پھیلے گی اور ہمارے ہاں تو ضرور آئے گی۔ اس طرح کسی حد تک ٹیلی ویژن کی تباہ کاری کے آگے چھوٹا موٹا بند باندھا جا سکے گا۔

وڈیو (Video)

ٹیلی ویژن سے ملتی جلتی چیز وڈیو کیسٹ ہے۔ جس طرح سمعی ذریعہ ابلاغ کی حیثیت سے ریڈیو کے فوائد آڈیو کیسٹ سے لیے جا سکتے ہیں، اس طرح بصری ذریعہ ابلاغ کی حیثیت سے ٹیلی ویژن کے فوائد وڈیو کیسٹ سے مل سکتے ہیں۔ طالب علم نے اکیلے پڑھنا ہو یا کلاس روم میں طلبہ کے پورے گروپ کو، دونوں صورتوں میں وڈیو کیسٹ بہت اچھے تعلیمی معاون کا کام دیتا ہے۔ ریموٹ (remote)، ری پلے (replay)، منظر کو ساکت (still) کرنے جیسی سہولتوں کی بدولت وڈیو کی افادیت کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ اس وقت پاکستان میں لاکھوں لائسنس یافتہ اور غیر لائسنس یافتہ وی سی آر موجود ہیں۔ تاہم اس حد تک اس موثر ذریعے سے کام نہیں لیا جا رہا جس حد تک استعداد موجود ہے۔ شہروں کے ہر گلی محلے اور اکثر و بیشتر دیہات میں گھریلو استعمال کے وڈیو کیمرے (vhs cameras) اور کیمرا مین دستیاب ہیں جو عموماً شادی بیاہ اور دوسری سماجی تقریبات کی عکس بندی کرتے ہیں۔ اسکول، کالج اور مکاتب ایسے وڈیو کیمروں اور وی سی آر سے فائدہ اٹھا کر اپنے تعلیمی پروگرام وضع کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے غیر سرکاری شعبے میں ایسی مجالس یا اسٹڈی فورم (study forum) تشکیل دیے جا سکتے ہیں جو نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کی وڈیو کیسٹ تیار کرنے اور اسے طلبہ کو دکھانے کا اہتمام کریں۔ ایسی تعلیمی سرگرمیوں سے وی سی

آر کے غلط استعمال اور بھارتی فلموں اور بے ہودہ پروگراموں سے بھی نوجوانوں کی توجہ ہٹے گی اور یہ ایک قومی خدمت ہوگی۔

فوٹوسٹیٹ اور فیکس (Photostat & Fax)

فروغ تعلیم کے ضمن میں فوٹو کاپی کرنے والی مشین اور فیکس (fax) مشین کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے جو کتابیں اور مضامین یا ان کے اجزا ہفتوں میں ہاتھ سے نقل ہوتے تھے یا پریس میں چھپتے تھے، اب ان کی نقلیں فوٹوسٹیٹ مشین سے ہاتھوں ہاتھ مل جاتی ہیں، اور اگر یہ مضامین یا کتاب کا کوئی باب ایک جگہ سے دوسری جگہ درکار ہو تو فیکس کی سہولت موجود ہے۔ ادھر صفحہ مشین پر رکھیں اور ٹیلی فون کا نمبر گھمائیں، ادھر چند سیکنڈ میں نقل دستیاب۔ یہ دونوں مشینیں اب تعلیمی اداروں کی ضرورت بن چکی ہیں۔

کمپیوٹر (Computer)

الیکٹرانک میڈیا میں سب سے زیادہ انقلاب آفرین چیز کمپیوٹر ہے۔ اس ایجاد نے نہ صرف زندگی کا چلن اور رفتار بدل دی ہے بلکہ انسانی تہذیب وتمدن اور ثقافتی رویوں پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ انسانی ذہن سے مشابہ یہ مشین صنعت وحرفت، تجارت، زراعت، طب، سائنس، ہوابازی، جہازرانی، امور مملکت، دفاع، اطلاعات ونشریات، تعلیم، غرض زندگی کے ہر شعبے میں انسان کی خدمت کے لیے سرگرم عمل ہے۔ اس کی صلاحیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ عام کمپیوٹر انسان کے مقابلے میں دس لاکھ گنا تیزی سے کام کرتا ہے اور سپر کمپیوٹر ایک ارب گنا تیزی سے۔ ریاضی کے جس پیچیدہ مسئلے کو انسان کاغذ اور قلم کی مدد سے سو سال میں حل کر سکتا تھا، وہ عام کمپیوٹر سے ایک دن میں اور سپر کمپیوٹر کے ذریعے ایک سیکنڈ میں حل کیا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں سپر کمپیوٹر نے ایک انتہائی پیچیدہ مسئلہ ایک ہفتے میں حل کیا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کاغذ قلم کے ذریعے اور جمع، ضرب، تقسیم کے روایتی طریقوں سے یہ مسئلہ حل کرنے میں پندرہ ارب سال لگتے جو غالباً کائنات کے آغاز سے اب تک کی مدت ہے۔

دنیا میں اس وقت چار سو سے زیادہ ایسے سپر کمپیوٹر موجود ہیں۔ کمپیوٹر تعلیم کے فروغ کا ایک ذریعہ بھی ہے اور بذات خود تعلیم کا موضوع بھی ہے۔ طلبہ انفرادی سطح پر بھی کمپیوٹر سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کلاس روم اور لیبارٹری میں بھی اس سے مدد لے سکتے ہیں۔ طالب علم اپنے نوٹس (notes) کمپیوٹر میں مرتب کر سکتا ہے، اپنی تحریر کی اصلاح اور تدوین کمپیوٹر کے ذریعے کر سکتا ہے، مارکیٹ سے اپنی ضرورت کی ڈسک (disk) خرید کر اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے اور خالی ڈسک پر اپنی معلومات ذخیرہ کر سکتا ہے۔ آج طباعت، اشاعت اور نشریات کا زیادہ تر کام پرانی مشینوں کی بجائے کمپیوٹرز یا کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر مبنی مشینوں سے کیا جاتا ہے۔

موڈیم (Modem)

اسی کمپیوٹر کے ساتھ اگر ایک مشین موڈیم (modem) لگا دی جائے تو کمپیوٹر میں ذخیرہ کیا جانے والا مواد (material) ایک جگہ سے دوسری جگہ اس طرح منتقل کیا جا سکتا ہے کہ مشین سے کاپی اترتے ہی اس سے چھپائی ہو سکتی ہے۔ مثلاً لاہور سے شائع ہونے والا کوئی اخبار اگر کراچی سے بھی اپنا ایڈیشن بیک وقت چھاپنا چاہے تو لاہور سے اس اخبار کے صفحات موڈیم کے ذریعے تھوڑے سے وقت کے اندر کراچی منتقل کر دیے جائیں گے اور وہاں بھی وہی اخبار بیک وقت چھپ سکے گا۔ اسی طرح مختلف اسکول اور مکتب بھی تعلیمی مقاصد کے لیے موڈیم سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

الیکٹرانک کلاس روم (Electronic Classroom)

الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کی ان وسعتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے ترقی یافتہ ممالک کے اسکولوں اور کالجوں میں الیکٹرانک کلاس روم بنائے جاتے ہیں۔ ایسے کلاس رومز میں طلبہ کے پاس کمپیوٹر اور ان کے سامنے مائیکروفون ہوتے ہیں۔ ایک طرف ریموٹ کنٹرول سلائیڈ پروجیکٹر یا ایسی مشین لگی ہوتی ہے جس کے ذریعے اسکرین پر تصویریں، گراف اور نقشے دکھائے جا سکیں، اس کے ساتھ ہی وی سی آر لگا ہوتا ہے اور کمرے میں دو یا تین کیمرے بھی نصب ہوتے ہیں۔ ان سب مشینوں اور کیمروں کے بٹن استاد کے سامنے میز پر لگے ہوتے ہیں

اور وہی انہیں کنٹرول کرتا ہے۔ استاد کے قریب ہی ٹیلی فون اور فیکس مشین ہوتی ہے۔ کلاس روم میں ہونے والی تمام کارروائی اس نظام سے منسلک تمام سکولز میں بیک وقت دیکھی جا سکتی ہے۔ ان میں سے کسی بھی سکول کے کسی بچے کو کوئی سوال کرنا ہو تو وہ فون یا فیکس کے ذریعے سوال کر سکتا ہے۔ جب استاد بچوں کا امتحان لیتا ہے تو ہر سکول کے بچے اپنا اپنا امتحانی پرچہ فیکس (fax) کے ذریعے استاد کو ارسال کر دیتے ہیں۔ الیکٹرانک کلاس روم کے دو بڑے فائدے ہیں: ایک تو یہ کہ طلبہ کو جدید ترین ذرائع سے تعلیم دی جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ جن سکولوں میں بعض مضامین کے اساتذہ موجود نہیں، وہاں طلبہ الیکٹرانک کلاس روم کے لیکچر سے فائدہ اٹھا کر وہ مضامین پڑھ سکتے ہیں۔

ملٹی میڈیا (Multi Media)

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا جدید ترین مرحلہ ملٹی میڈیا کا ہے جس میں کمپیوٹر، آڈیو، وڈیو، اور معلومات یا digital data کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس طرح طالب علم آواز، بصری مواد اور کمپیوٹر کی صلاحیت سے بیک وقت فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ٹیکنالوجی کی اس پیش رفت سے ویسے تو زندگی کے ہر شعبہ میں کام لیا جا رہا ہے، لیکن تعلیم کے فروغ میں اس کی خصوصی اہمیت ہے۔ حال ہی میں اس ٹیکنالوجی کو ایک نئی جہت ملی ہے۔ سائنس دانوں نے آواز، تصویر اور معلومات data کو دبا کوٹ کر یا compress کر کے کم سے کم جگہ میں پیک کیا ہے اور اسے پیکٹ (pakcet) وڈیو کے نام سے پیش کیا ہے۔ اس طرح ملٹی میڈیا کے استعمال میں سہولت ہوگئی ہے۔ ایک منصوبے کے تحت اگلے چند سال کے دوران امریکہ کے زیادہ تر اسکولوں کو پیکٹ وڈیو نظام کے ساتھ منسلک کر دیا جائے گا۔

الیکٹرانک پبلشنگ (Electronic Publishing)

تعلیم کے فروغ میں کمپیوٹر کے کردار کا غالباً سب سے روشن پہلو الیکٹرانک اشاعت یا پبلشنگ ہے۔ اب بڑی بڑی کتابیں، بلکہ کتابیں ہی نہیں پوری پوری لائبریریاں کمپیوٹر ڈسک پر دستیاب ہوں گی۔ بات کو واضح کرنے کے لیے ایک ہی مثال کافی ہے۔

کوئی دوسو سال پہلے برطانیہ کے شہر ایڈنبرا میں پڑھے لکھے لوگوں کی ایک انجمن بنی تھی جس نے مختلف موضوعات پر ایک قاموس، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (Encyclopedia Britannica) کے نام سے مرتب کر کے شائع کی۔ وقفے وقفے سے اس کتاب پر نظر ثانی ہوتی رہی، اس کے موضوعات کا دائرہ کار وسیع ہوتا گیا اور ضخامت بڑھتی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں اس کتاب کی اشاعت کے حقوق امریکہ کے شہر شگاگو کی ایک کمپنی نے حاصل کر لیے اور مختلف وقفوں سے یہ کتاب چھپتی رہی، لیکن اس کی اشاعت بتدریج کم ہوتی گئی۔ ۱۹۹۰ء میں بتیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اس کتاب کے ایک لاکھ سترہ ہزار نسخے اور پچھلے سال صرف اکاون ہزار نسخے فروخت ہوئے، لیکن پچھلے سال ہی ایک کمپیوٹر فرم نے سرمایہ لگا کر اس انسائیکلو پیڈیا کا الیکٹرانک ایڈیشن جاری کر دیا ہے۔ اس الیکٹرانک ایڈیشن میں پورا انسائیکلو پیڈیا یعنی اصل کتاب کی تمام جلدوں کے چار کروڑ چالیس لاکھ الفاظ شامل ہیں اور کتاب کے متن کے ساتھ ساتھ ان کی تشریح اور سمعی اور بصری معاونت کے لیے تصویریں، نقشے، ویڈیو اور آوازیں بھی شامل ہیں۔ عموماً ایک کتاب ہلکی پھلکی ڈسک پر جاری کی جاتی ہے جو بہت کم جگہ گھیرتی ہے۔ یوں سینکڑوں الماریوں کی جگہ پوری لائبیریری ایک چھوٹے سے بریف کیس میں آجاتی ہے اور علم کے اس ذخیرے کا وزن منوں یا ٹنوں میں نہیں، چند کلوگرام ہوگا۔

ڈیجیٹل ٹرانسمیشن (Digital Transmission)

علم کا ذخیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے ایک تکنیک معلومات کی برق رفتار منتقلی کی ہے۔ جب تار برقی یا ٹیلی گراف کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو پیغام کا ایک ایک حرف مختلف صوتی اشاروں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا تھا۔ ذرا ترقی ہوئی تو ٹیلی پرنٹر کے ذریعے پیغامات نسبتاً تیز رفتاری سے منتقل ہونے لگے، یعنی حرفوں کی کھٹ کھٹ کی جگہ پورے لفظ، پھر پورے پورے جملے اور پھر پورے پورے پیراگراف منتقل ہونے لگے۔ ترقی کا اگلا مرحلہ یہ تھا کہ آپریٹر (operator) کئی صفحوں کا پیغام ٹیلی پرنٹر (tele printer) پر ٹائپ کر کے محفوظ کر لیتا اور پھر جونہی وہ ٹرانسمیشن کے لیے مشین کا بٹن دباتا تو کئی صفحوں پر مشتمل پیغام چند لمحوں کے اندر

دوسری جگہ منتقل ہو جاتا۔ اب ٹیکنالوجی کی نئی وسعتوں اور خاص طور پر بال جیسے باریک تار آپٹیک فائبر (optic fiber) کے ذریعے یہ پیغامات بلکہ یوں کہیے کہ کتابوں کی کتابیں پلک جھپکتے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتی ہیں۔ اس ٹیکنالوجی کا ایک اور پہلو مطبوعہ معلومات، ٹیلی ویژن سکرین کے ذریعے ناظرین تک پہنچانا ہے جسے ٹیلی ٹیکسٹ (tele text) کہتے ہیں۔

انٹرنیٹ (Internet)

الیکٹرانک میڈیا کی طلسماتی دنیا کا تازہ ترین شاہکار انٹرنیٹ ہے۔ انٹرنیٹ کو سمجھنے کے لیے ایک چھوٹی سی مثال پیش خدمت ہے۔

ہماری زمین نظام شمسی کا حصہ ہے۔ اس نظام شمسی میں کرہ ارض کے علاوہ اور بھی کئی سیارے ہیں جو بیک وقت اپنے اپنے مدار میں اور سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ سورج جیسے اور اربوں ستارے ہیں جن کے گرد سیاروں کا جھرمٹ ہے۔ اربوں سیاروں اور ستاروں کے یہ سارے جھرمٹ مل کر ہماری کہکشاں بنتے ہیں جسے آسمانوں کا (milky way) کہا جاتا ہے۔ اب تک کی معلومات اور تخمینوں کے مطابق کائنات میں ہماری کہکشاں جیسی تقریباً ایک کھرب کہکشائیں ہیں اور خالق کائنات کی تخلیق کا عمل اب بھی جاری ہے۔ انٹرنیٹ کی مثال کمپیوٹروں کی کائنات جیسی ہے۔ بہت سے کمپیوٹر مل کر ایک کہکشاں یا جال یعنی network بناتے ہیں، اور بہت سی کمپیوٹر کہکشائیں جب بین الاقوامی سطح پر آپس میں مربوط ہو جاتی ہیں اور ایک بہت بڑا جال بن جاتا ہے تو اسے انٹرنیٹ کہتے ہیں۔ یوں سارے کمپیوٹر اس جال یا نظام کے ساتھ منسلک ہو سکتے ہیں اور ایک کمپیوٹر دنیا کے کسی بھی گوشے میں موجود دوسرے کمپیوٹر سے رابطہ قائم کر کے مطلوبہ معلومات لے سکتا ہے۔

اس وسیع و عریض جال یا کمپیوٹر نیٹ ورک کی داغ بیل اس طرح پڑی کہ پچیس سال پہلے امریکی محکمہ دفاع نے کچھ اس طرح کا انتظام کرنا چاہا کہ اگر امریکہ پر ایٹمی حملے میں محکمہ دفاع کا کمپیوٹر نظام تباہ بھی ہو جائے تو بھی فوجی ماہرین اور یونیورسٹیوں کے سائنس دان جنگی سرگرمیوں سے متعلق اپنا تحقیقی کام جاری رکھ سکیں۔ آہستہ آہستہ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں، سرکاری محکموں

اور بہت سے صنعتی اداروں کو نیٹ ورک سے منسلک کر دیا گیا۔ اس کمپیوٹر نظام کے لیے تکنیکی معاونت اور اخراجات بھی ان تعلیمی، سرکاری اور صنعتی اداروں نے برداشت کیے۔ جن سائنس دانوں کو اس کمپیوٹر جال یا انٹرنیٹ سے مفت استفادہ کرنے کی اجازت ملی، انہوں نے محسوس کیا کہ تحقیقی سرگرمیوں اور سرکاری کام نمٹانے کے علاوہ بھی یہ نظام کئی اور کام کر سکتا ہے۔ انہوں نے اس کمپیوٹر نظام کے ذریعے ایک دوسرے کو ذاتی پیغامات اور مراسلے بھیجنے شروع کر دیے۔ کمپیوٹر کے ذریعے اس طرح کی خط و کتابت کو الیکٹرانک ڈاک یا email کہا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر استعمال کرنے والے دوسرے لوگوں نے بھی اس کمپیوٹر جال یا نظام کے ساتھ رابطہ کرنا شروع کر دیا اور یہ جال یوں وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس نظام کو استعمال کرنے والوں نے خود ہی اپنے ضابطے اور آداب وضع کر لیے اور نئے آنے والے کے لیے ان ضابطوں اور آداب کی پابندی لازمی قرار دی۔

انٹرنیٹ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی طرح یک طرفہ ذریعہ ابلاغ نہیں کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی! یہ تو دوطرفہ ابلاغ کا ذریعہ ہے جس کی بدولت آپ دنیا میں کسی بھی کمپیوٹر استعمال کرنے والے کے ساتھ ہم کلام ہو سکتے ہیں اور اس کا طریقہ بھی آسان ہے۔ جس شخص کے پاس کمپیوٹر ہو، وہ کسی بھی کمپیوٹر نیٹ ورک سروس سے رابطہ کر سکتا ہے اور اس کے ذریعے انٹرنیٹ سے اپنی الیکٹرانک ڈاک منگوا بھی سکتا ہے اور بھیج بھی سکتا ہے۔ اس طرح انٹرنیٹ کی آف لائن اور آن لائن سروس (offline online service) سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے ٹیلی فون رابطہ بھی ہو سکتا ہے اور دوسرے کمپیوٹروں سے معلومات اور دستاویزات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً پاکستان میں کسی ڈاکٹر کو بلڈ پریشر کے بارے میں کسی پیچیدہ سوال کا جواب چاہیے تو وہ انٹرنیٹ کے ذریعے اس شعبہ کے ماہرین سے رابطہ کرے گا اور اگر اسے اپنے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا تو وہ اپنے کمپیوٹر کے ذریعے اپنا سوال پھر انٹرنیٹ پر بھیج دے گا۔ بالکل ایسے جیسے کوئی بچہ بہتی ندی میں کاغذ کی ناؤ ڈال دے، یہ ناؤ جس پر سوال لکھا ہے، ندی میں تیرنے والے یا کنارے پر کھڑے کسی دوسرے بچے کے ہاتھ لگے اور وہ اس سوال کا جواب دے دے، اسی طرح

انٹرنیٹ سے منسلک کوئی بھی کمپیوٹر اس سوال کا جواب دے دے گا۔ یہ جواب مفت بھی ہو سکتا ہے اور وہ اس کا معاوضہ بھی طلب کر سکتا ہے۔ اس طرح کسی ملک کا کوئی تعلیمی ادارہ کسی بھی دوسرے ملک کے تعلیمی اداروں یا لائبریریوں سے رابطہ قائم کر کے اپنی مطلوبہ معلومات یا دستاویزات حاصل کر سکتا ہے اور یوں علم کی ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں کروڑوں افراد انٹرنیٹ سے استفادہ کر رہے ہیں۔

آن لائین پبلشنگ (Online Publishing)

انٹرنیٹ کی آن لائین سروس (online service) کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اب بہت سے جرائد انٹرنیٹ پر شائع ہوتے ہیں۔ صرف پچھلے سال امریکہ میں ڈیڑھ سو سے زیادہ ایسے رسالے شروع ہوئے جو انٹرنیٹ پر شائع ہوتے ہیں۔ یہ جرائد مختلف موضوعات پر ہیں۔ اگر خریدار چاہے تو انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے کمپیوٹر پر یہ رسالہ خرید سکتا ہے۔ اخبار نویسی کی اس قسم کو انٹرنیٹ صحافت کا نام دیا گیا ہے۔

شاہراہ اطلاعات (Information Highway)

ملٹی میڈیا کی ان سہولتوں کو بڑی تیزی سے ترقی دے کر شاہراہ اطلاعات تعمیر کی جا رہی ہے، معلومات کی ایسی شاہراہ جو دنیا کے ہر ملک اور ہر گوشے کو ایک دوسرے سے منسلک کر دے گی۔ ایسی شاہراہ جس پر اطلاعات کی چھوٹی بڑی سڑکیں اور کروڑوں راستے اور پگڈنڈیاں آملیں، یہ شاہراہ علم کے فروغ اور معلومات کے تبادلے کے لیے بھی استعمال ہوگی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اندازہ یہ ہے کہ اس شاہراہ کی بدولت صرف کیبل ٹیلی ویژن کے پانچ سو چینل دستیاب ہوں گے۔ دفتری اور کاروباری امور نمٹانے، بنکوں سے پیسے نکلوانے، فضائی کمپنیوں سے سفر کے معاملات طے کرنے، دوستوں کے ساتھ گپ شپ، ڈاکٹر اور وکیل سے مشورہ کرنے اور ثقافتی اور تفریحی سرگرمیوں کے لیے بھی یہ شاہراہ کام دے گی۔

الیکٹرانک میڈیا کے یہ سارے کمالات اور ان کی افادیت کے سارے امکانات آپ کے سامنے ہیں۔ اپنے نظریات اور مقاصد بھی آپ پر واضح ہیں اور ان کے فکری، علمی اور عملی تقاضوں

سے بھی آپ باخبر ہیں۔اس پس منظر میں ان جدید ذرائع ابلاغ سے تعلیم کے فروغ میں کیا اور کس طرح کام لیا جاسکتا ہے؟اس پر غور کرنے اور اقدامات تجویز کرنے کی ضرورت ہے۔

نسل نو کی تعلیم و تربیت اور ہمارا نظام تعلیم

ـــــ جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ ـــــ

[سابق صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان]

اس وقت وطن عزیز میں تعلیم کے دو نظام چل رہے ہیں۔ ایک نظام دینی مدارس کا ہے اور دوسرا دنیوی درسگاہوں کا جو آگے چل کر کئی حصوں میں تقسیم ہے جیسے انگلش میڈیم، اردو میڈیم، جاگیرداروں اور رؤسا کے بچوں کے اسکول اور عام آدمی کے بچوں کے لیے تعلیمی ادارے وغیرہ۔ انگریز نے برصغیر کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور ۱۸۵۷ء میں بھی مسلمان ہی جنگ آزادی کا ہراول دستہ تھے، اس لیے فرنگی اسلام، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے خلاف شدید جذبات رکھتا تھا۔ اس پس منظر میں رسوائے زمانہ میکالے نے ایک شیطانی نظام تعلیم مرتب کر کے دعویٰ کیا کہ اس سے ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی مگر خیالات و تمدن میں انگریز ہوگا۔ اس نظام تعلیم کے نفاذ سے دو مقاصد کا حصول اس کے پیش نظر تھا۔ دفتروں کے لیے کلرک پیدا کرنا اور مسلمانوں کو ان کے دین سے بیگانہ کر کے دینی اقدار سے محروم کرنا۔

نظام تعلیم ہی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ولیم ہنٹر نے اسلام اور اسلامی تعلیمات پر انتہائی رکیک حملے کیے اور اسلامی نظام کا تمسخر اڑایا۔ نوآبادیاتی دور کے ڈیڑھ دو صدیوں پر محیط لمبے دورانیے میں فرنگی نے مسلمانوں میں اپنے کاسہ لیس، وطن فروش ٹوڈیوں کے خاندانوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ اپنی چال ڈھال، نشست و برخاست اور بودوباش میں آج تک مغربی

معاشرہ کی ''نقل بمطابق اصل'' ہیں اور وطن عزیز میں قیادت کا تاج گزشتہ ۵۰ برس سے انہی خاندانوں کے افراد کے سروں پر سجتا چلا آرہا ہے۔ٹوڈیوں کی اس نسل کے ذریعے سے ایک طرف تو عصری نظام تعلیم کو بد سے بدتر شکل میں ڈھالا جارہا ہے اور دوسری طرف نیوورلڈ آرڈر کے سب سے بڑے ہدف دینی مدارس پر یلغار اور مار دھاڑ کے ارادے بن رہے ہیں۔گزشتہ دنوں اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ بلوچستان میں ابتدائی جماعتوں کی کتاب سے حمد باری تعالیٰ نکال دی گئی ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ایسا تو انگریز کے دور میں بھی نہیں ہوا تھا۔ان دنوں ہر اسکول میں پڑھائی شروع ہونے سے پہلے مختلف منظوم دعاؤں میں سے کوئی ایک دعا پڑھی جایا کرتی تھی جس میں تمام بچے، خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو، شریک ہوا کرتے تھے۔ایک دعائیہ نظم کا بند اب تک یاد ہے جو یوں تھا:

بحر عصیاں کا کوئی کنارہ نہیں
غرق ہونے کو ہیں، کوئی چارہ نہیں
بن تیرے کوئی بھی تو سہارا نہیں
اپنی رحمت سے ہم سب کو مولا بچا
ہم ہیں بندے ترے تو ہمارا خدا

یہ قریب قریب آیت مبارکہ 'ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین' کا ترجمہ ہے۔فرنگی کے مسلط کردہ نظام تعلیم کے متعلق علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین ومروت کے خلاف

یہ نظام ہمیں اپنے ماضی سے کاٹتا اور طاغوت سے جوڑتا ہے۔

انگریز کی تعلیم نے رکھا نہ کہیں کا
مذہب کا نہ ملت کا نہ دنیا کا نہ دیں کا

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ ڈبوں کا پیا تعلیم ہے سرکار کی

اس نظام تعلیم کی حامل اعلیٰ ترین یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل لوگ اس بدقسمت ملک پر حکمران ہیں۔ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے ان کی کارکردگی کھلی آنکھوں دیکھ بلکہ بھگت رہے ہیں۔ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مرتب کردہ نیوورلڈ آرڈر کو آگے بڑھانے کی شرط پر اپنے اپنے عہدوں پر قائم ہیں۔ ان سے یا ان جیسے دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں سے نفاذ اسلام کی توقع ایسے ہی ہے جیسے تھوہر کے پودے سے انگور کے خوشوں کی آرزو کرنا۔

جمہوریت ایک ایسا طاغوتی نظام ہے جو ایک چھٹے ہوئے بدمعاش اور شیخ الاسلام کی رائے کو برابر کا درجہ دیتا ہے، اور اب تو سونے پر سہاگہ ہونے کو ہے کہ قادیانیوں سمیت ہر غیر مسلم کی رائے دو مومنوں کے برابر کرنے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ مغربی تعلیم یافتہ دانشور یہ دلیل دیتے ہیں کہ پاکستان کو وجود میں لانے کے لیے تو جداگانہ انتخاب ضروری تھا، مگر اس کے استحکام کے لیے مخلوط طریق انتخاب ضروری ہے۔ یعنی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بچے کی پیدائش تک تو ماں کی ضرورت تھی، لیکن اس کی نشوونما اور اچھی تربیت کے لیے ماں سے مختلف یا متضاد شخصیت کی حامل خاتون زیادہ بہتر ہوگی۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

کرۂ ارض اسلام کے دور حکمرانی اور اس کی برکتوں سے ان شاء اللہ پھر مستفیض ہوگا، مگر جمہوریت سے نہیں بلکہ اسلامی انقلاب کے ذریعے سے، ویسا ہی پرامن انقلاب جیسا مکہ معظّمہ کے مظلوموں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں ظلم وجور، گمراہی، جہالت اور بے راہ روی کی قوتوں کے خلاف برپا کر کے کرہ ارض کی تقدیر بدل دی تھی۔ ایسے انقلاب کے لیے امریکہ، فرانس وغیرہ سے اسلحہ کی بھیک مانگنے کی نہیں بلکہ انسان سازی کی ضرورت ہے۔

جب اسلام کے خلاف ایک نئے نظام تعلیم کے ذریعے میکالے، ہنٹر اور ان کے گماشتے سازش کر رہے تھے تو اس وقت کے علماے حق نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی قیادت میں انتہائی بے

سروسامانی کے عالم میں جگہ جگہ دینی مدارس قائم کر کے اسلام کے تحفظ اور دفاع کا حق ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں ہوں ان پر اور ان کے جانشینوں پر جو انسان سازی کا فریضہ انتہائی نامساعد اور ابتر حالات میں سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے زیر اہتمام چلنے والے دینی اداروں کی وجہ سے تمام طاغوتی سازشوں اور کوششوں کے باوجود اب بھی ملک کی بڑی بھاری اکثریت دینی اقدار سے جذباتی وابستگی اور محبت رکھتی ہے اور وقت آنے پر جان تک کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے یہ دینی مدارس اسلام کے قلعے ہیں جن سے ہدایت کی روشنی پھیلتی اور ظلمت دم توڑتی ہے۔ دینی مدارس کا یہ کردار اسلام دشمن ابلیسی قوتوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور وہ عالم اسلام میں اپنے گماشتوں کے ذریعے سے انہیں ختم کرنے کے درپے ہیں۔

علامہ اقبال کی نظم ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' اس صورت حال کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے جس میں ابلیس اپنے سیاسی فرزندوں سے یوں مخاطب ہے کہ:

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ان شاء اللہ اسلامی انقلاب آئے گا اور ضرور آئے گا، اس کو کوئی نہیں روک سکتا اور دینی ادارے اس کا ہراول دستہ ہوں گے، البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ دینی اور عصری تعلیم کے

درمیان فاصلوں کو کم کیا جائے اور ان اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے جو نئی نسل کے لیے دینی اور عصری علوم کے متوازن امتزاج کے ساتھ ایک ایسے تعلیمی نظام کے تصور کو آگے بڑھا رہے ہیں جو ہماری دینی اور قومی ضرورتوں اور آج کی عالمی صورت حال میں ملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو بار آور کریں تا کہ ہم پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک مثالی اسلامی ریاست کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کر سکیں، آمین۔ و ما علینا الا البلاغ المبین۔

دینی مدارس کا نظام تعلیم وتربیت

الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام تربیتی ورک شاپ

(منعقدہ دسمبر ۲۰۰۳ء)

دینی مدارس کے اساتذہ کیا سوچتے ہیں؟

ـــــ ابوعمار زاہد الراشدی ـــــ
[ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ]

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ۳۔۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کو دینی مدارس کے اساتذہ کی دو روزہ باہمی مشاورت اور نصاب تعلیم و تربیت کے حوالے سے مختلف امور پر مذاکرہ و مباحثہ کا اہتمام کیا گیا۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ، جامعہ حقانیہ گوجرانوالہ، جامعہ فتاح العلوم گوجرانوالہ، دارالعلوم مدنیہ رسول پارک لاہور، جامعہ قاسمیہ گوجرانوالہ، جامعہ عربیہ چنیوٹ، جامعہ حنفیہ قادریہ باغ بان پورہ لاہور، جامعہ اسلامیہ کامونکی، جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم، جامعہ فاروقیہ سیالکوٹ اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے تیس کے لگ بھگ اساتذہ نے اس مشاورت و مذاکرہ میں حصہ لیا۔ پہلی نشست کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے سینئر ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے کی اور شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے ''درس نظامی کی اہمیت وافادیت'' پر مقالہ پڑھا۔ دوسری نشست کی صدارت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے ''طلبہ کی دینی واخلاقی تربیت'' کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ تیسری نشست کی صدارت جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی نے کی اور اس میں وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب میں کی جانے والی حالیہ ترامیم کے بارے میں شرکاء مذاکرہ نے باری باری اظہار خیال کیا جبکہ چوتھی اور آخری

نشست راقم الحروف کی زیر صدارت منعقد ہوئی جس میں معہد اللغۃ العربیۃ اسلام آباد کے مولانا محمد بشیر سیالکوٹی نے ''دینی مدارس میں عربی کی تعلیم کا منہج اور ضروری اصلاحات'' کے عنوان پر اظہار خیال کیا اور راقم الحروف نے ''فکری اور مسلکی تربیت کے چند اہم پہلو'' کے عنوان پر گفتگو کی۔

پروگرام کے آغاز پر راقم الحروف نے اس کا مقصد بیان کرتے ہوئے گزارش کی کہ اس مشاورت اور مذاکرہ ومباحثہ کے اہتمام میں ہمارے سامنے دو اہم مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ دینی مدارس کے اساتذہ میں تعلیم وتربیت کے مسائل پر باہمی تبادلہ خیالات، غور وخوض اور بحث ومباحثہ کا ذوق پیدا ہو اور اس کا ماحول بنے اور دوسرا یہ کہ دینی مدارس کے نصاب ونظام اور تعلیم وتربیت کے حوالے سے اس وقت جو امور قومی بلکہ عالمی سطح پر موضوع بحث ہیں اور جن کے بارے میں ہر طرف سے آرا وتجاویز سامنے آ رہی ہیں، ان پر دینی مدارس کے اساتذہ کی آرا اور موقف بھی سامنے آئے اور جو لوگ دینی مدارس میں طلبہ کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری براہ راست سرانجام دے رہے ہیں، ان کے رجحانات اور سوچ سے بھی لوگوں کو واقفیت حاصل ہو۔

اس مذاکرہ ومباحثہ کے ساتھ ہم اس کا آغاز کر رہے ہیں اور آئندہ بھی الشریعہ اکادمی متعلقہ مسائل وامور پر دینی مدارس کے اساتذہ کی باہمی مشاورت ومباحثہ کا وقتاً فوقتاً اہتمام کرتی رہے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مذاکرہ ومشاورت کی مختلف نشستوں میں طلبہ کی تعلیم وتربیت اور وفاق المدارس کے ترمیم شدہ نصاب کے بارے میں اساتذہ نے جن خیالات کا اظہار کیا، ان کا خلاصہ قارئین کی معلومات کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

o وفاق المدارس کے نصاب میں جو ترامیم اور تبدیلیاں کی گئی ہیں، وہ خوش آئند ہیں اور ان کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن یہ ناکافی اور وقتی ہیں۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ آئندہ کم از کم نصف صدی تک کی ممکنہ صورت حال اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک جامع پالیسی طے کی جائے اور بجائے اس کے کہ ہر تین چار سال کے بعد جزوی

تبدیلیاں کی جاتی رہیں، پچاس سال کے لیے ایک اصولی لائحہ عمل کا تعین کیا جائے۔ مثلاً ہم نے کچھ عرصہ قبل مڈل کی سطح کی تعلیم کو نصاب میں شامل کیا اور اب میٹرک کی عصری تعلیم کو ضروری کہتے ہوئے نصاب کا لازمی حصہ بنا لیا ہے۔ اگر ہم نے چار سال کے بعد ایف اے اور پھر چار پانچ سال کے بعد بی اے کو بھی شامل کرنا ہے تو اس کے بجائے بہتر ہے کہ یہ فیصلہ ابھی سے کر لیا جائے تاکہ مدارس کے منتظمین، اساتذہ اور طلبہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں۔ اور اگر اس سے آگے کے عصری نصاب کو شامل کرنا ضروری نہیں ہے تو ابھی سے حتمی طور پر کہہ دیا جائے تاکہ تذبذب اور گومگو کی فضا ختم ہو اور اساتذہ وطلبہ دل جمعی کے ساتھ کام کو آگے بڑھا سکیں۔

o مڈل تک کے نصاب کو دینی مدارس کے لیے ضروری قرار دیا گیا تو اس کا تاثر یہ تھا کہ دباؤ اور مجبوری کے تحت ایسا کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نصاب کی تعلیم ہمارے ہاں اہتمام اور خوش دلی کے ساتھ نہیں ہو رہی بلکہ محض رسم پوری کرنے اور امتحان میں پاس ہونے کی حد تک اس کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ خدشہ یہ ہے کہ میٹرک کے بارے میں بھی ایسا ہوگا اور ہمارے طلبہ میٹرک کر لینے کے بعد بھی میٹرک کے درجہ کی صلاحیت سے محروم رہیں گے، اس لیے یہ بات بھی ابھی سے اور دوٹوک انداز میں طے کرنے کی ہے کہ اگر تو یہ سب کچھ دباؤ اور مجبوری کی وجہ سے کیا جا رہا ہے تو ایسا کرنے کی کوئی ضرورت وافادیت نہیں ہے بلکہ دباؤ قبول کرنے سے کھلے لفظوں میں انکار کر دینا چاہیے اور اگر فی الواقع اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور ہم خود اس کی افادیت کا احساس کرتے ہوئے اسے شامل نصاب کرنا چاہتے ہیں تو پھر میٹرک کے نصاب کی تعلیم بھی خوش دلی اور اہتمام کے ساتھ ہونی چاہیے اور اس کے مضامین کی پوری طرح تیاری کرائی جانی چاہیے تاکہ ہمارے طلبہ اس معاملے میں دوسرے سکولوں کے طلبہ سے پیچھے نہ رہیں۔

o عربی کی تعلیم کے حوالے سے وفاق المدارس کے نصاب میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں، وہ جزوی طور پر افادیت کی حامل ضرور ہیں لیکن ان سے اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ عربی زبان کی تعلیم سے بنیادی طور پر ہمارے دو مقصد ہیں۔ ایک یہ کہ فارغ التحصیل عالم دین کا قرآن وسنت، فقہ اسلامی اور دیگر علوم اسلامی کے ساتھ تعلق ورابطہ مضبوط ہو اور وہ ان سے صحیح طور پر استفادہ کر

سکے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ آج کے ماحول اور ضروریات کے مطابق عربی زبان میں گفتگو کر سکے، بوقت ضرورت خطاب کر سکے، آج کے عربی لٹریچر سے استفادہ کر سکے اور مروجہ عربی زبان میں لکھ پڑھ سکے۔ درس نظامی میں عربی زبان کے حوالے سے جن علوم اور مواد کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے پہلا مقصد تو کسی حد تک پورا ہو جاتا ہے لیکن دوسرا مقصد کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں ہوتا اور فارغ التحصیل علما بلکہ سالہا سال تک تدریس کا فریضہ سرانجام دینے والے اساتذہ کرام بھی مروجہ عربی میں گفتگو اور لکھنے پڑھنے کی صلاحیت واستعداد سے محروم رہتے ہیں۔ اس کمزوری کو دور کرنا انتہائی ضروری ہے اور وفاق المدارس کے نصاب میں کی جانے والی حالیہ ترامیم سے یہ خلا پر نہیں ہوگا بلکہ صورت حال جوں کی توں رہے گی۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مقصد قدیم عربی اور اس کے متعلقہ علوم کی اہمیت کم کرنا نہیں بلکہ اس کے ساتھ جدید عربی اور اس کے تقاضوں کو شامل کرنا ہے تاکہ ہمارے فضلا قدیم لٹریچر سے استفادہ کی بھرپور صلاحیت کے ساتھ ساتھ جدید اور مروجہ عربی زبان میں بھی ضروری استعداد حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے عربی زبان کی تعلیم کے جدید اسلوب اور ادب عربی کے جدید لٹریچر سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ناگزیر ہے اس لیے کہ اس کے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکے گا۔

o وفاق المدارس نے نصاب میں ترمیم واضافہ کے حوالے سے سب سے زیادہ ضروری اور اہم مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور وہ ہے اساتذہ کی تربیت اور تدریس کی فنی ٹریننگ کا نصاب جس کی غیر موجودگی بہت سی کمزوریوں اور خرابیوں کا باعث بن رہی ہے۔ ہمارے ہاں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نصاب یا نظام موجود نہیں ہے۔ صرف دورۂ حدیث کی سند میں ذہین طالب علم کی سند پر لکھ دیا جاتا ہے کہ ''یہ تدریس کی صلاحیت رکھتا ہے'' اور وہ بھی تدریس کی کسی عملی تربیت کے بغیر۔ یہ طریق کار درست نہیں ہے۔ معاصر تعلیمی نظاموں میں پرائمری سکول کے استاذ کا تقرر بھی باقاعدہ کورس کی تکمیل کے بغیر نہیں ہوتا جبکہ اس سے اعلیٰ درجوں کے لیے سال سال اور دو دو سال کے تربیتی نصاب ہیں جو ٹیچر بننے والے کو لازمی طور پر پڑھنا پڑتے ہیں لیکن ہمارے ہاں کسی عملی اور فنی تعلیم وتربیت کے بغیر کوئی بھی فاضل اپنی ذہانت یا تعلقات کی بنیاد پر مسند تدریس پر فائز ہو

جاتا ہے۔

خود ہمارے ہاں کچھ عرصہ قبل تک افتا کا کوئی باضابطہ کورس نہیں ہوتا تھا اور کوئی ذہین مدرس کسی پختہ کار مفتی کی نگرانی میں چند سال عملی تجربہ حاصل کر کے مفتی کے منصب پر فائز ہو جایا کرتا تھا مگر اب اسے کافی نہیں سمجھا جا رہا بلکہ افتا کا باقاعدہ نصاب طے کیا گیا ہے اور کورس مقرر کیا گیا ہے جس کی تکمیل مفتی کے منصب کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح استاذ کے منصب کے لیے بھی سابقہ طریق کار پر قناعت کافی نہیں ہے بلکہ تدریس کی فنی تربیت اور اس کے ساتھ ساتھ عملی استعداد میں اضافہ اور فکری اور اخلاقی و دینی تربیت کی ضروریات پر مشتمل نصاب کی ترتیب ضروری ہے اور یہ کام وفاق المدارس ہی کو کرنا چاہیے کیونکہ استاذ تمام تر ذہانت اور لیاقت کے باوجود اگر تدریس کے فن سے آگاہ نہیں ہے تو وہ اپنا علم طلبہ تک صحیح طور پر منتقل نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ خود کسی فکری کج روی کا شکار ہے تو اس کی یہ متعدی بیماری طلبہ تک منتقل ہوگی اور اگر اس کی دینی و اخلاقی تربیت ضرورت کے مطابق مکمل نہیں ہے تو اس کے شاگرد بھی اسی کے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاں عملی طور پر ہو رہا ہے اور اس کے تلخ نتائج بھی ہم اپنے ماحول میں دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح مدرس اور استاذ کے لیے تیار کیے جانے والے تربیتی نصاب میں طلبہ کی نفسیات اور آج کے ماحول سے آگاہی کو شامل کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ بہت سے طلبہ صرف اس لیے تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں کہ ان کے مزاج، نفسیات اور ماحول کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ان کے لیے تعلیم کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

o فکری اور اعتقادی تعلیم کے حوالے سے بھی ہمارا نصاب تشنہ ہے۔ ''شرح عقائد'' اور ''العقیدۃ الطحاویۃ'' بہت ضروری اور مفید کتابیں ہیں جن کا شامل نصاب رہنا ضروری ہے۔ ان میں اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد کی ضروری تشریح موجود ہے لیکن جن گمراہ فرقوں کے عقائد کا ان کتابوں میں تذکرہ ہے، وہ صدیوں پرانے ہیں جواب موجود نہیں ہیں یا پہلے سے مختلف شکلیں اختیار کر چکے ہیں جبکہ آج کے گمراہ فرقوں اور ان کے عقائد کے حوالے سے ہمارے نصاب میں کوئی مواد موجود نہیں ہے اور اس سلسلے میں پانچ درجوں پر ضروری مواد کو شامل نصاب کرنے کی

ضرورت محسوس کی جا رہی ہے:

۱۔ معاصر ادیان و مذاہب مثلاً مسیحیت، یہودیت، ہندومت، سکھ ازم اور بدھ مت وغیرہ کے بارے میں تعارفی اور تقابلی مواد

۲۔ اسلام سے منحرف مذاہب مثلاً قادیانیت، بہائیت، نیشن آف اسلام وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات

۳۔ اسلام سے منسوب گمراہ گروہوں مثلاً رافضیت اور منکرین حدیث وغیرہ کا تعارف

۴۔ اہل سنت کے داخلی مذاہب مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری اور سلفی وغیرہ کا تعارف اور تقابلی مطالعہ

۵۔ مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کا تاریخی پس منظر اور اسلام کے ساتھ اس کی کشمکش کی موجودہ صورت حال

اس ضروری مواد کو نصاب میں شامل کرنے کے لیے مستقل کتابوں کی تصنیف کی ضرورت ہے جو تدریسی نقطہ نظر سے اور تدریسی انداز میں تحریر کی گئی ہوں یا دوسری صورت یہ ہے کہ ان کے بارے میں محاضرات کا اہتمام ہو لیکن اس کے لیے اساتذہ کی تیاری اور انہیں متعلقہ مواد کی فراہمی ضروری ہو گی تاکہ وہ محاضرات کی صورت میں اپنے تلامذہ کو صحیح معلومات دے سکیں۔

o اسلامی معیشت کے بارے میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کی کتاب شامل نصاب کی گئی ہے جو بہت مفید اور ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جدید معاشی نظام اور علم معیشت کا تعارفی مطالعہ شامل نصاب کیا جائے کیونکہ جب تک طالب علم جدید معیشت کے اصول اور طریق کار سے واقف نہیں ہو گا، اس کے لیے اسلام کے معاشی احکام و قوانین اور جدید معاشی نظام میں فرق کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہو گا۔ اس کے علاوہ جدید سماجی علوم اور جنرل سائنس کا تعارفی مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس کا مقصد ان علوم کی باقاعدہ تعلیم نہیں بلکہ ان کے مبادیات، بنیادی اصطلاحات اور افادیت سے طلبہ کو واقف کرانا ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ آج کے مجموعی ماحول، ضروریات اور آج کی مروجہ زبان و اصطلاحات سے آگاہی حاصل نہیں کر

سکیں گے۔

o طلبہ کی فکری تربیت کی طرف توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ اس وقت عملی صورت حال یہ ہے کہ جس استاذ کے ساتھ کسی طالب علم کا ذہنی میلان ہوتا ہے، وہ اسی کے فکر اور سوچ سے منسلک ہو جاتا ہے اور ایک ہی درس گاہ میں مختلف سوچوں اور فکری اہداف کے الگ الگ دائرے بن جاتے ہیں جو تعلیم سے فراغت کے بعد نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ مزید ترقی کرتے ہیں جس سے فکری خلفشار پیدا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کے تدارک کی طرف وفاق المدارس کی قیادت کو توجہ دینی چاہیے اور اجتماعی فکری اہداف کا ایک دائرہ طے کر کے اسے اساتذہ کے تربیتی پروگرام کا حصہ بنانا چاہیے تاکہ وہ طلبہ کی صحیح رخ پر تربیت کر سکیں۔

o دینی اور اخلاقی تربیت کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ فرائض وواجبات کی ادائیگی، باہمی حقوق ومعاملات اور عام لوگوں کے ساتھ میل جول کے آداب کی صورت حال تسلی بخش نہیں ہے اور اس کا زیادہ تر تعلق بھی اساتذہ سے ہے۔ اساتذہ اخلاقی اور دینی لحاظ سے مضبوط کردار کے حامل ہوں گے تو طلبہ پر اس کے اثرات ہوں گے اور اگر اساتذہ کی اخلاقی اور دینی حالت کمزور ہوگی تو طلبہ کی حالت اس سے زیادہ کمزور ہوگی۔ اس لیے اس سلسلے میں مدارس کے اساتذہ اور منتظمین کے ساتھ مسلسل رابطہ اور ان کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

قارئین کرام!

یہ ہے خلاصہ اس گفتگو کا جو مختلف دینی مدارس کے اساتذہ نے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی دو روزہ مشاورت کے دوران متعدد مجالس میں کی۔ اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دینی مدارس کے نصاب ونظام کی موجودہ صورت حال اور اس میں اصلاح وترامیم کی ضروریات کے بارے میں ان اساتذہ کی سوچ کیا ہے اور وہ کس انداز سے ان امور پر غور کرتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ اساتذہ کے مابین مشاورت، باہمی تبادلہ خیالات اور بحث ومباحثہ کے اس دائرہ کو وسیع کیا جائے، مختلف علاقوں میں دینی مراکز اس کا اہتمام کریں بلکہ خود وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے زیر اہتمام قومی اور علاقائی سطح پر ایسی مشاورتوں اور مباحثوں کا

انعقاد ہو تو اس کی افادیت اور اثرات زیادہ نمایاں ہوں گے۔

امید ہے کہ ارباب بست وکشاد دینی مدارس کے اساتذہ کی ان آرا وتجاویز کو سنجیدہ توجہ سے نوازیں گے اور باہمی مشاورت ومباحثہ کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں مثبت کردار ادا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ دینی مدارس کی حفاظت فرمائیں اور ہم سب کو دینی تعلیم کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور اس کی اہمیت وافادیت

ــــــ مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی ــــــ
[سابق صدر شعبہ افتاء، مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ]

فارسی زبان وادب

درس نظامی میں سب سے پہلے جس زبان کو اولیت حاصل ہے، وہ فارسی ہے اس لیے کہ عربی گریمر یعنی صرف ونحو کی بعض کتب فارسی میں لکھی گئی ہیں جو ہمارے نصاب میں داخل ہیں۔ نیز اکثر علوم وفنون کے تراجم، شروح اور حواشی فارسی میں ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ شروع میں اس معیار کی فارسی پڑھائی جائے کہ پیش آمدہ کتب اور ان کے تراجم، شروح اور حواشی کے پڑھنے میں آسانی ہو اور بخوبی ان کو سمجھا جا سکے۔ نیز مختلف موضوعات پر اکابر علما اور مشائخ ہند کی اکثر وبیشتر کتب فارسی میں ہیں۔ اگر شروع میں فارسی زبان میں رسوخ پیدا نہ ہو تو بعد میں اس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے۔ ایک مستند عالم اگر فارسی نہیں جانتا، تو یہ بہت بڑی کمزوری ہے اور جو اپنے بزرگوں کے علوم وفنون سے استفادہ نہ کر سکے، تو یہ کتنی بڑی محرومی ہے۔

فارسی نصاب میں جن علما کی تالیفات کو شامل کیا گیا ہے، ان میں شیخ سعدیؒ ہیں۔ ان کی ابتدائی کتاب 'کریما' اور انتہائی کتب 'بوستان' اور 'گلستان' ہیں۔ شیخ شرف الدین بخاریؒ کی کتاب 'نام حق' کا وہ پایہ نہیں ہے جو زبان اور بیان کے اعتبار سے ایک درسی کتاب کا ہونا چاہیے۔ مصنف کی قبولیت اور مبتدی کے لیے طہارت اور نماز کے ضروری اور آسان مسائل نصاب میں اس کے

داخل ہونے کا باعث ہوئے ہیں۔ شیخ فرید الدین عطارؒ کی کتاب 'پند نامہ' جس میں سلوک اور ہدایت کے راہنما اصول بیان کیے گئے ہیں، نصاب میں داخل ہے۔ اسی طرح مولانا جامیؒ اور علامہ نظامیؒ کی 'زلیخا' اور 'سکندر نامہ' پڑھائی جاتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ جس نے 'پند نامہ' پڑھا اور اسے درویشی اور معرفت حاصل نہ ہوئی، اس نے 'پند نامہ' نہیں پڑھا۔ جس نے 'بوستان' اور 'گلستان' پڑھی اور اسے تجربات عالم سے آگاہی نہ ہوئی، اس نے یہ کتابیں نہیں پڑھیں۔ اسی طرح جس نے 'زلیخا' پڑھی اور عشق مجازی سے عشق حقیقی تک رسائی حاصل نہ کر سکا، اس نے 'زلیخا' نہیں پڑھی، اور جس نے 'سکندر نامہ' پڑھا اور اس میں فنون حربیہ سے شناسائی اور جرات پیدا نہ ہوئی، اس نے یہ کتاب نہیں پڑھیں۔

اس نصاب کی تکمیل پر حسب صلاحیت سال یا دو سال لگ جاتے ہیں۔ زبان دانی کے ساتھ اس میں تہذیب اخلاق اور اصلاح اعمال کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے۔

عربی صرف ونحو

فارسی نصاب کی تکمیل کے بعد عربی گریمر کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے دو اہم جزو ہیں، علم صرف اور علم نحو۔ علم صرف میں عربی الفاظ اور ان کے اشتقاق کے بارے میں بحث ہوتی ہے، ساتھ ہی ان الفاظ میں جو تغیر رونما ہوتا ہے، اس کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے لیے کچھ قوانین اور ضوابط کی ضرورت پڑتی ہے۔ متعلم جب الفاظ کے اشتقاق اور اس کے متعلقہ قواعد میں مہارت پیدا کر لیتا ہے تو اس کے لیے صیغہ کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ 'صیغہ' کہتے ہیں لفظ کی موجودہ شکل کو۔ علم صرف سے اس کی اصل ہیئت کا علم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اصل میں کیا تھا اور اس میں یہ تبدیلی کیسے رونما ہوئی۔ نیز یہ مجرد ہے یا مزید، اور کس باب سے ہے۔ غرضیکہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہے۔ 'صیغہ' کی پہچان علم 'صرف' کا مقصود اصلی ہے۔

علم صرف کے بعد علم نحو کا آغاز ہوتا ہے جس میں مفرد الفاظ کے بجائے جملہ اور کلام پیش نظر ہوتا ہے کہ اس میں ایک لفظ کا دوسرے سے کس طرح کا تعلق ہے۔ پھر یہ لفظ معرب ہے یا مبنی۔ معرب ہے تو اس پر کون سا اعراب ہے، رفع نصب، جر یا جزم۔ غرضیکہ الفاظ کی ترکیب، تعلیق اور

اعراب اس علم میں مطلوب ہیں۔ عربی گریمر اور صرف ونحو کتنا عمیق علم ہے اور اس میں کس قدر محنت درکار ہے، اس کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل حکایت سے ہوگا۔

ابن جنی جامع موصل میں نحو پڑھا رہے تھے، وہاں سے ابوعلی فارسیؒ کا گزر ہوا۔ انہوں نے ان سے علم صرف کا کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ وہ جواب دینے میں کامیاب نہ ہوئے۔ ابوعلیؒ نے کہا، تم نے کچے انگوروں کا منقیٰ بنالیا ہے۔ اس دن سے ابن جنیؒ نے ابوعلیؒ کا دامن پکڑا حتیٰ کہ چالیس سال گزر گئے۔ جب ابوعلیؒ فوت ہوئے تو ابن جنیؒ اپنے استاد کی مسند پر بیٹھے۔ ابن جنیؒ کے بارے میں متنبیؔ کہا کرتے تھے کہ یہ ایک ایسا شخص ہے کہ اکثر لوگ اس کی قدر کو نہیں پہچانتے۔ ابن جنیؒ کبھی متنبیؔ کے سامنے اس کے اشعار نہیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ اپنے کو اس سے کہیں بڑا سمجھتے تھے۔

ہمارے سلسلۂ تعلیم میں اس امر کا بھی خیال رکھا جانا چاہیے کہ ایک درجے میں اچھی طرح مہارت حاصل کیے بغیر دوسرے درجے کی تعلیم کا آغاز نہ کیا جائے۔ علم نحو میں 'مائۃ عامل' کے اشعار میں جو عوامل نحو ذکر کیے گئے ہیں، ان کی امثلہ اور تراکیب اچھی طرح حفظ کرا کے 'شرح مائۃ عامل' شروع کرائی جائے۔ اس میں مسائل اور تراکیب کا مرحلہ اہم ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کیونکہ نحوی ترکیب سمجھے بغیر عربی کا پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نصاب کی مروجہ کتب پر انحصار نہ کیا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ فن کی نصابی کتب کے علاوہ ایک دو اور اضافی اور مفید کتابیں پڑھی جائیں۔ بعض علما ترکیب واعراب میں مبتدی کی استعداد بڑھانے کے لیے قرآن مجید کی کسی سورت یا پارہ کا انتخاب کرتے ہیں اور اس میں مبادئ ترکیب وقواعد نحویہ کا اجرا کراتے ہیں۔

'ہدایۃ النحو' ابوحیان اندلسیؒ کی تصنیف ہے۔ اس میں علامہ ابن حاجبؒ کی مشہور ومعروف کتاب 'کافیۂ' کے مسائل کی تسہیل کی گئی ہے اور ان کی امثلہ اور شواہد کو واضح کیا گیا ہے تاکہ اس کے بعد پڑھی جانے والی کتاب جو اصل الاصول ہے، اس کے سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اس کتاب میں وہ اکثر وبیشتر نحوی مسائل آ گئے ہیں جو 'کافیۂ' میں ہیں۔ 'کافیۂ' میں جس بات کو مدنظر رکھا گیا ہے، وہ عبارت کا ایجاز واختصار ہے۔ اس کے پڑھنے سے قبل ضروری ہے کہ اس کے مسائل پر عبور حاصل

کرلیا جائے۔ 'کافیہ' کی عبارت بہت پیچیدہ ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ 'کافیہ' میں اصل مقصود اس کی عبارت کا سمجھنا ہے۔ مسائل کا درجہ ثانوی ہے۔ بعض مدارس میں اس کی جگہ 'الفیہ ابن مالکؒ' پڑھاتے ہیں جس میں مسائل نحویہ کو بمع امثلہ سہل انداز میں لایا گیا ہے۔ اس کے اشعار ضبط کر لینے سے کافی حد تک مسائل پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ حفظ کر کے مشکل سے مشکل اعراب میں 'الفیہ' کے اشعار سے برجستہ استدلال کیا جا سکتا ہے۔ 'کافیہ' متن المتون کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد اس کی شرح جو کہ 'شرح جامی' کے نام سے معروف ہے، مطالعہ کی کتاب ہے۔ 'کافیہ' کو سمجھ کر پڑھنے والا طالب علم 'شرح جامی' کے اکثر و بیشتر مطالب کو اپنے مطالعہ سے حل کر لیتا ہے۔ درس میں استاد کی تقریر سے اس کا اطمینان ہو جاتا ہے کہ مطالعہ میں، میں نے جو سمجھا تھا، وہ صحیح ہے۔ اس طرح مطالعہ کا شوق پیدا ہوتا ہے اور عادۃً مطالعہ سے مشکل مقامات حل کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

'شرح جامی' کے حواشی 'عبدالغفور'، 'لاریؒ'، اور 'تکملہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی' سب میں مطالعاتی نظام ہے۔ اس سے علمی حقائق اور دقائق سے واسطہ پڑتا ہے جس کے توسط سے مشکل سے مشکل مقامات حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

عربی ادب

محاورات عرب اور ان کے اسلوب میں کلام کرنا، محل و موقع کی مناسبت سے ضرب الامثال لانا، برجستہ موضوع پر خطاب کے لیے تیار رہنا، مختلف پیرایے میں بیان پر قدرت اس فن کا موضوع ہے۔ ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے ہر کتاب کے مناسب، اس کتاب کے الفاظ و محاورات کا خیال کرتے ہوئے استاد اردو کی ایک سادہ عبارت املا کرائے اور متعلم اس کی تعریب پیش کرے۔ مثلاً 'نفحۃ الیمن' درس نظامی میں ادب عربی کی پہلی کتاب ہے جسے احمد یمنی نے تصنیف کیا۔ یہ تیرہویں صدی کے ادیب تھے۔ مولانا رشید الدین خان دہلوی صاحب ''المکاتیب'' کے دوست تھے اور انہی کے توسط سے مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ بھی ان کی ادبی عربی خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ 'نفحۃ الیمن' میں مختلف موضوعات پر عجیب و غریب حکایات تحریر کی

گئی ہیں۔ یہ کتاب تجربات کا خزینہ ہے۔نحوی تراکیب کے لیے اس کی عبارات موزوں ہیں۔ ادبی کتب کی تدریس کے وقت زبان وبیان پر عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نحوی مشق کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے تاکہ متعلم اپنی ابتدائی کتابوں میں عبارت اور ترکیب میں کمال پیدا کر لے اور اسے آئندہ مطولات میں دشواری کا سامنا نہ ہو۔

علم معانی

اس علم سے مقصود یہ ہے کہ کلام میں لفظی اور معنوی اصلاح کی جائے۔اس میں کسی قسم کا عیب نہ ہو اور مقاصد اور مطالب کے لیے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا جائے جس سے کسی قسم کا خفا باقی نہ رہے اور ترکیب ادا بھی حسین اور دل آویز ہو۔اس علم کی نزاکت کو ایک حکایت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

کسائیؒ نے کہا کہ عرب کہتے ہیں:'ان الزنبور اشد لسعة من النحلة فاذا هو ایاها'۔سیبویہ نے کہا کہ یہ غلط ہے۔مثل یوں ہے:'فاذا هو هی'۔اس پر مناظرہ کی نوبت آ گئی۔ یہ طے ہوا کہ اس مثل کو کسی خالص اعرابی سے دریافت کر لیا جائے۔فریقین کی تحقیق اور وسعت علم کا اس کو دارومدار ٹھہرایا گیا۔خلیفہ امین نے جو کسائی کے شاگرد تھے، ایک اعرابی کو بلایا اور اس سے اس مثل کے بارے میں پوچھا۔اعرابی نے سیبویہ کے کلام کی تائید کی۔امین نے اس پر زور دیا کہ تم کسائی کے کلام کی تائید کرو۔اعرابی نے جواب دیا کہ میری زبان سے غلط مثل نہیں نکل سکتی، اس لیے میری زبان پر'فاذا هو هی' ہی جاری ہوتا ہے۔امین نے کہا کہ مضائقہ نہیں، لیکن تم سے ایک شخص پوچھے گا کہ سیبویہ یوں کہتے ہیں اور کسائی کا یہ قول ہے، ان دونوں میں سے حق پر کون ہے؟ تم کہنا کہ کسائی حق پر ہیں۔اعرابی نے کہا کہ ہاں یہ کہنا ممکن ہے۔القصہ'فاذا هو هی' اور'فاذا هو ایاها' میں لفظی طور پر صرف ضمائر کا فرق ہے اور ضمیر بھی دونوں میں مونث ہے لیکن یہ اتنی بڑی نازک بات تھی کہ اس پر نحو کے دو اماموں کا مناظرہ ہوا۔

واضح رہے کہ قرآن عربی زبان میں ہے، جس ذات پر اتارا گیا وہ بھی عربی ہے، اس لیے عربی زبان کا اس کے قواعد وضوابط کے ساتھ اور محاورات کے توسط سے حاصل کرنا لازمی ہے۔انا

انزلنه قرآنا عربیا لعلکم تعقلون (یوسف)''ہم نے اس کتاب کو عربی زبان میں نازل کیا تا کہ تم سمجھ سکو'۔ بلسان عربی مبین (شعراء)''قرآن واضح عربی زبان میں ہے۔''وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه (ابراہیم)''ہم نے کسی رسول کو پیغام دے کر نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان کے موافق۔''

ان آیات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اور اس پر نازل کردہ کتاب کی اصل زبان کا سیکھنا فرض ہے تا کہ علوم الٰہیہ اور علوم نبویہ کا علیٰ وجہ البصیرۃ کماحقہ ادراک کیا جا سکے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

عربی علوم میں اس درجہ کے حصول کے بغیر قرآن وحدیث کا صحیح فہم پیدا نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ کوئی شخص اس سلسلے کا ہادی اور امین ہو۔ کتنا بڑا ظلم ہے کہ محض بی اے اور ایم اے کی سطح پر عربی کے امتحان پاس کر لینے والوں کو 'مولانا' کہا دیا جاتا ہے۔

علم فقہ

'فقہ' کہتے ہیں فہم وشعور کو۔ فقہا کی اصطلاح میں 'فقہ' ایک مشہور علم ہے جس میں احکام بیان کیے جاتے ہیں، خواہ وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، قرآن مجید کی نصوص صریحہ یا احادیث صحیحہ کی واضح عبارات سے ثابت ہوں یا ان کا ثبوت قرآن وحدیث سے بطور استنباط کے کیا گیا ہو، یا اجماع اور قیاس کے واسطہ سے۔ ان سب امور پر فقہ کا اطلاق ہوتا ہے۔

دنیا میں نئے وقائع وحوادث کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ فقہی مسائل واحکام کا دائرہ ان کی نسبت بہت تنگ اور محدود ہے، لہٰذا داعیہ پیدا ہوا کہ فقہ کے ایسے قواعد وضوابط وضع کیے جائیں جن کی مدد سے ان مسائل کا استخراج واستنباط کیا جا سکے جو ابھی تک وجود میں نہیں آئے۔ ائمہ مجتہدین نے قرآن واحادیث کی روشنی میں اس طرح کے قواعد وضع کیے ہیں جن کو 'اصول فقہ' کہتے ہیں۔

جو شخص روایت اور درایت دونوں صفات سے متصف ہو، وہ فقیہ اور اصولی کہلانے کا مستحق ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: ان یکون صاحب حدیث له معرفة بالفقه لیعرف

معانی الآثار او صاحب فقه له معرفة بالحدیث لئلا یشتغل بالقیاس فی المنصوص علیه۔ یعنی محدث ہو جو فقہ کی معرفت بھی رکھتا ہو تا کہ آثار واحادیث کے معانی کو اچھی طرح پہچان سکے، یا فقیہ ہو اور ساتھ اسے حدیث کی معرفت حاصل ہو تا کہ منصوص علیہ مسائل میں قیاس کے درپے نہ ہو۔

فقہ حنفی کی وہ کتب مطولہ جو روایت اور درایت پر مشتمل ہیں اور جن میں ادلہ، معاریض، مباحث اور مناظرہ ہے، وہ تین ہیں:

(۱) شمس الائمہ سرخسی کی ''المبسوط'' جو نہ صرف دلائل اور براہین کا مجموعہ ہے بلکہ اس فقیہ نے مسائل اور مواقف راجحہ کی حکمت اور فضیلت بیان کرنے کا بھی التزام کیا ہے۔ عبارت نہایت فصیح، آسان اور قریب الفہم ہے اور ہر مسئلہ کو احادیث و آثار سے واضح کیا ہے۔ یہ خصوصیت کسی اور فقیہ کے ہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یاد رہے کہ امام سرخسیؒ نے مبسوط کی پندرہ جلدیں اوزجند، خراسان کے جیل خانے میں، جو ایک بند کنویں کی شکل میں تھا، اپنی یادداشت سے املا کروائیں۔ ان کے تلامذہ کنویں کے دہانے پر بیٹھ کر اسے قلم بند کر لیتے تھے۔ باقی کی پندرہ جلدیں انہوں نے بالمشافہہ پڑھائیں۔ حاکم شہیدؒ نے امام محمدؒ کی کتب ستہ یعنی الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، المبسوط، الزیادات، السیر الصغیر اور السیر الکبیر کی تلخیص کی اور اس کا نام ''الکافی'' رکھا۔ سرخسی کی ''المبسوط'' اس کی شرح ہے۔

(۲) ملک العلماء علامہ کاسانی کی ''بدائع الصنائع''۔ انہوں نے اپنی اس اچھوتی تصنیف میں فقہ کے ایسے اصول قائم کیے ہیں جو ان شاء اللہ رہتی دنیا تک آنے والے حوادث کے لیے کافی ہوں گے۔ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں کہ فتاویٰ شامیہ میں اگرچہ فقہی جزئیات بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن اگر جدید مسائل میں اصول وکلیات دیکھنے ہوں، تو اس کے لیے 'بدائع الصنائع' سے رجوع کرنا چاہیے۔

(۳) علامہ برہان الدین مرغینانی کی ''الہدایہ''۔ ائمہ اربعہ کے مابین دلائل کا تلاطم اور تسلسل، پھر امام اعظم ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے مابین دلائل کا توازن اور تبادلہ، اس کے بعد ترجیح، یہ

ایسے پہلو ہیں جن سے قاری کو علم فقہ، اصول فقہ اور ساتھ ہی جدال بالاحسن کا فن آ جاتا ہے اور اسے سمجھ کر پڑھنے والا اس فن کا ماہر کہلاتا ہے۔ درس نظامی میں 'ہدایہ' کی چاروں جلدیں داخل نصاب ہیں۔

علم منطق

منطق، نطق سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی بات کرنے اور بولنے کے ہیں لیکن مناطقہ کی اصطلاح میں اس کے معنی 'ادراک' کے ہیں۔ تنہا ادراک بھی منطق نہیں بلکہ کسی مسئلہ کو اس کے کلیات اور اصول کے ذریعے کما حقہ سمجھنا، بدیہی اور عقلی استدلال کے ذریعے مجہول اور نظری نتائج اخذ کرنا منطق کا موضوع ہے۔ اصل میں یہ یونانیوں کا مصطلح فن ہے۔ وہ اس کے ذریعے اہل اسلام میں تشکیک پیدا کر کے ان کو ان کے معتقدات سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے تھے تو ہمارے قدما اہل اسلام نے اس فن کو نصاب میں داخل کیا تا کہ ان کے استدلالات سے اسلامی اصولوں کو ثابت کیا جائے اور انہی کی منطق سے اسلام کے خلاف ان کے دعاوی کا رد کیا جائے۔ اسی سلسلے میں امام غزالیؒ کی کتاب 'تہافت الفلاسفۃ' اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب 'الرد علی المنطقیین' ہے۔ مشہور ہے کہ اگر ایک شخص سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت نہیں کر سکتا تو وہ منطقی نہیں ہے۔ ہم اسے انقلاب استدلال سے تعبیر کرتے ہیں۔

تاریخ

یہ ایک طبعی اور فطری موضوع ہے۔ خوراک اور لباس کی طرح ہر حساس شخص کو اس سے پالا پڑتا ہے اس لیے تاریخ کی کسی اہم کتاب کو درس نظامی کے نصاب میں شامل نہیں کیا گیا، لیکن یہ ایک ایسا ضروری امر ہے کہ اس کے بغیر اسلامی تاریخ اور اسلامی سیاست کے موضوعات تشنہ رہ جاتے ہیں۔ اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ارباب علم کو اس میں افادیت کی حامل کتب کو داخل نصاب کر لینا چاہیے۔

دورۂ تفسیر

قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حضرت مولانا حسین علیؒ (آف واں بھچراں، میانوالی) نے جب ۱۳۰۱ھ میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی تو آپ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ سے قرآن کی تفسیر پڑھ لو، تو آپ نے مظاہر العلوم سہارنپور میں ۱۳۰۲ھ میں ان سے تفسیر پڑھی۔ حضرت مولانا حیدر حسن ٹونکیؒ فرماتے ہیں کہ مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کا طریقہ یہ تھا کہ سب سے پہلے وہ علمائے کرام کو تفاسیر متداولہ (مدارک، خازن، جلالین، بیضاوی) کا مطالعہ کراتے، پھر شاہ عبد القادر دہلویؒ کا ترجمہ اور اس کے حواشی 'موضح قرآن' کا درس دیتے تھے تاکہ اس ترجمہ اور اس کے حواشی کے فوائد کی قدر و منزلت کا پتہ چلے اور امام شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی اور ان کے خانوادہ کا فن تفسیر میں مقام معلوم ہو۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن عظیم را درس گوید بایں صفت کہ صرف قرآن بخواند بغیر تفسیر و ترجمہ گوید و ہر چہ در اعراب و شان نزل مشکل باشد متوقف شود و بحث نماید و بعد از فراغ تفسیر جلالین را بقدر درس بیند۔ دریں طریق فیضہا است۔''

یعنی قرآن مجید کا اس طرح درس دیں کہ تفسیر کے بغیر صرف ترجمہ بتلائیں اور نحو یا شان نزول میں جہاں مشکل ہو، ٹھہر جائیں اور تحقیق کریں۔ اس سے فراغت کے بعد تفسیر جلالین کا درس کی مقدار مطالعہ کریں۔ اس طریقے میں بہت فیوض ہیں۔

حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کے توسط سے حضرت مولانا حسین علی میانوالویؒ کو فن تفسیر کا فیضان الٰہی نصیب ہوا اور وہ عمر بھر قرآن کا درس دیتے رہے۔ وہ توحید کے مبلغ اور داعی تھے اور ان کا فیض جاری وساری ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کے حکم سے حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دہلی میں 'نظارۃ المعارف' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں ولی اللہی طریقے پر قرآن کی تفسیر اور ان کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' دو اہم موضوع تھے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ چھ ماہ میں تفسیر مکمل کراتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے کلکتہ میں 'دارالرشاد' کے نام سے قرآنی ادارہ

قائم کیا اور علمائے کرام کے لیے چھ ماہ میں سورہ فاتحہ کا درس ہوتا تھا۔ اس ترتیب اور طریق تعلیم کو دورۂ تفسیر کہتے ہیں اور امام شاہ ولی اللہؒ اس کے موجد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہند و پاک میں امام شاہ ولی اللہؒ کے دیگر آثار و تبرکات کی طرح دورۂ تفسیر بھی معمول بہ ہے۔

دورۂ حدیث

آج سے تین سو سال قبل دورۂ حدیث مشکوٰۃ شریف تک پڑھایا جاتا تھا اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی شروح کے مطابق اس کی تفصیل و تحقیق کی جاتی تھی۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے صحاح ستہ اور موطا امام مالک کو دورۂ حدیث کے نصاب میں شامل کر کے احادیث نبویہ کی حتی الوسع بڑی خدمت سرانجام دی ہے اور اس کے بعد دیگر کتب احادیث کو مطالعہ پر موقوف رکھا ہے۔

تکمیل

تکمیل سے ہماری مراد درج ذیل امور ہیں:

۱۔ ہر فن کی انتہائی کتب، مثلاً امور عامہ، متن متین اور شرح چغمینی وغیرہ۔

۲۔ تخصص فی الفقہ والافتاء، تخصص فی الحدیث، تخصص فی الکتابۃ والانشاء، تخصص فی المجادلۃ مع الفرق الباطلۃ۔

۳۔ مشائخ صوفیہ مثلاً امام غزالیؒ، شیخ ابن عربیؒ، امام مجدد الف ثانیؒ، مولانا رومیؒ، امام شاہ ولی اللہؒ، قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتویؒ وغیرہ کی کتب میں تحقیق و تفتیش۔

۴۔ قومی زبان میں تحریر و انشا اور تصنیف و تالیف میں تخصص

الحاصل درس نظامی کے نصاب میں دیگر علوم اصول فقہ، علم کلام، فلسفہ وغیرہ موضوعات کی اہم کتب داخل ہیں۔ ہماری گفتگو کا موضوع درس نظامی اور اس میں پڑھائے جانے والے علوم کی افادیت ہے، درس نظامی میں شامل کتب پر سیر حاصل تبصرہ نہیں۔ اس نصاب کی تکمیل سے ایک شخص اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ خلق خدا کی راہنمائی کرے، علم و عمل کی راہ پر چل کر اپنے آپ کو بطور نمونہ پیش کر سکے۔ درس نظامی ایک ایسا نصاب ہے جسے صدہا سال سے بطور تجربہ پڑھا گیا اور

پڑھایا جاتا رہا ہے۔ اس پر عبور حاصل کرنے سے اس قدر خداداد قابلیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تنہا اسلام پر کیے گئے مطاعن کا جواب دے سکتا ہے اور اس سے وہ ملکی امارت اور خلافت کا بھی استحقاق رکھتا ہے۔

اس نصاب میں تبدیلی بایں معنی کہ جس زبان میں قرآن اترا ہے، وہ زبان بدل دی جائے اور ادب قدیم کے بجائے ادب جدید پڑھایا جائے، یہ علم نہیں ہوگا بلکہ جدید قسم کی جہالت ہوگی، البتہ یہ ضروری ہے کہ ادب جدید اور ادب قدیم دونوں سے استفادہ کیا جائے۔ مکالمہ اور محادثہ، مراسلت اور مقالات اور روزہ مرہ معاملات میں ان سے کام لیا جائے۔

حفظ وضبط

بعض اہل علم یہ خیال کرتے ہیں کہ العلم دانستن، یعنی علم جاننے کا نام ہے جبکہ حفظ کرنا ایک اضافی امر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اس سلسلے کی بہت بڑی کاہلی اور کمزوری ہے۔ اگر کسی جگہ ہنگامی طور پر حالات حاضرہ کے متعلق کچھ بیان کرنے کی نوبت آئے تو ایسے لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی بہت بڑی کوتاہی ہے۔ اور کچھ نہیں تو کیا موضوع سے متعلق قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبویہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند فرامین اپنی یادداشت سے نہیں سنا سکتے؟ یہ تو پھر وہی بات ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کی مذمت کی ہے: و نسوا حظا مما ذكروا به (مائدہ) ''وہ اپنی کتاب میں سے اس قدر حصہ بھول گئے جس میں ان کو خدا کی یاد دلائی گئی تھی۔'' قرآن وحدیث کا اچھا خاصا حصہ یاد کر کے اسے بار بار دہرانا چاہیے۔ اس یادداشت کو ہم مطالعہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی ذمہ داری انبیا، ربانیین اور متبحر علما کے سپرد کی ہے۔ 'ربانی' کہتے ہیں اس فقیہ عالم کو جو اپنے علم پر عمل پیرا ہو، جو خلق خدا کی تربیت کر کے انہیں ابتدائی مدارج سے انتہائی مدارج پر پہنچا دے۔ 'حبر' کہتے ہیں اس ماہر اور کامل عالم کو جو اپنے شعبہ میں مثالی ہو۔ انہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا گواہ ٹھہرایا ہے۔ يحكم بها النبيون الذين اسلموا للذين هادوا والربانيون والاحبار بما استحفظوا من كتاب الله وكانوا عليه

شهداء (مائدہ)۔

قرآن وحدیث میں مہارت تامہ حاصل کیے بغیر اور کسی استاد اور شیخ کامل سے کسب کمال کے بغیر ایسا شخص خلق خدا کی رشد وہدایت کا اہل نہیں ہوسکتا۔ امتحانی حد تک کسی زبان میں ڈگری یا سٹرٹیفکیٹ حاصل کرنا، اردو لٹریچر پڑھ کر از خود مجتہد اور مفسر بن جانا ایسا عہدہ نہیں کہ اسے خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کا ترجمان یا ذمہ دار ٹھہرایا ہو۔ حاشا وکلا۔ ایسا شخص تو مندرجہ ذیل حدیث کا مصداق ہوگا:

> قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من العباد ولكن يقبض العلم بقبض العلماء حتى اذا لم يبق عالما اتخذ الناس رء وسا جهالا فسئلوا فافتوا بغير علم فضلوا واضلوا (متفق علیہ)

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری زمانہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے عطا کردہ علم یوں واپس نہ لے گا کہ زبردستی چھین لے، بلکہ علما کی موت کی صورت میں علم کو واپس لے لے گا۔ حتیٰ کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کسی عالم کو باقی نہ رکھے گا یا کوئی عالم دنیا میں باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا راہنما بنالیں گے، ان سے مسائل دریافت کیے جائیں گے تو وہ بغیر علم اور فہم کے فتویٰ دیں گے۔ خود بھی گمراہی میں پڑ جائیں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔''

ملاعلی قاری نے لفظ 'رء وس' کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد خلیفہ، صدر، قاضی، مفتی، امام، شیخ اور پیر ومرشد ہیں۔ یعنی لوگ جاہلوں کو صدر مملکت، حاکم، مفتی، امام اور پیشوا تسلیم کرلیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیچری طبقہ جو قرآن وحدیث کو اپنی خام خیالی اور ناقص عقل کے ترازو میں تولنے کا روادار ہے، اسی طرح ان کے دم چھلے قادیانی، پرویزی اور ان کے ہم نوا ملحد فرقے سب اسی شجرہ خبیثہ کی شاخیں ہیں۔ اعاذنا اللہ منہا

تعلیم وتربیت

اللہ تعالیٰ نے خلق خدا کی تعلیم وتربیت کا جو طریقہ ارشاد فرمایا ہے، وہ صحیح اور فطری ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے حق میں اسے تجویز کیا ہے۔ وہ ہے مربی کا تلاوت کے ذریعے سے تزکیہ اور کتاب وسنت کی تعلیم۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت، جس سے بڑھ کر کوئی چیز باعث ہدایت نہیں ہوسکتی۔ کیا انسان کے بنائے ہوئے کورس سے یہ کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی موعظت پر عمل کریں، قرآن کی شفا میں اپنی بیماریوں کا علاج تلاش کریں، اس کی بتلائی ہوئی راہ پر چلیں اور اس کی رحمت کے سزاوار ہوں جس سے بڑھ کر کوئی فضل ورحمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں خشیت، تقویٰ اور اخلاص کا درس اصالتاً موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ادوار واطوار ہمارے لیے کافی وشافی ہیں۔ ان میں صرف مربی کے توجہ دلانے سے خود آگاہی اور شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ کتب عقائد وفقہ میں اصلاح اعمال کے زریں اصول موقع بہ موقع موجود ہیں۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔ علم معانی اور علم ادب کا نصاب مربی اور استاد پر منحصر ہے۔ اگر وہ صاحب اصلاح اور احوال تربیت سے واقف ہے تو تذکرہ وتبصرہ کے طور پر ان علوم سے مستفیدین کے مناسب حال بہترین نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ان چیزوں سے اگر وہ اثر نہیں لیتا تو پھر اور کون سا موثر کلام اور عمل ہوسکتا ہے جس سے وہ راہ راست اختیار کرے گا۔ ہر چیز کے لیے رسمی کورس اور تیاری کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایسی چیزیں تو مطالعہ اور تجربہ سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مستفیدین بھی مستعد اور باصلاحیت ہوں۔ درس نظامی میں سارے تعلیمی مرحلے درجہ بدرجہ تہذیب اخلاق اور اعمال کے ساتھ طے ہوتے ہیں تو تعلیم وتربیت کے لیے مستقل نصاب کا رسمی تعین اور مستقل استاذ کا انتخاب بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

دینی مدارس کا نظام تربیت

چند اصلاح طلب پہلو

ـــــ ڈاکٹر محمد امین ـــــ

[سینئر ایڈیٹر، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور]

الحمد لله و كفى والصلوة والسلام على نبى الهدى۔ اما بعد۔ قال سبحانه وتعالى فى كتابه الكريم 'كما ارسلنا فيكم رسولا منكم يتلوا عليكم آياتنا ويزكيكم ويعلمكم الكتاب والحكمة'۔ وقال النبى صلى الله عليه وسلم 'ادبنى ربى فاحسن تاديبى'۔

حاضرین کرام!

مجھے جب عمار ناصر صاحب نے بتایا کہ وہ دینی مدارس کے اساتذہ کی ایک مجلس مشاورت رکھنا چاہ رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ انہوں نے میرے لیے ''تربیت طلبہ'' کا موضوع تجویز کیا ہے، تو میں نے ان سے کہا کہ میرے ذہن میں تو کچھ اور باتیں تھیں جن کو اس موقع پر بیان کرنا میں زیادہ مناسب سمجھتا تھا، تاہم جب آپ نے ایک چیز طے کر لی ہے اور چھپا ہوا پروگرام بھی لوگوں کو بھجوا دیا ہے تو اب مجوزہ عنوان پر ہی اپنی معروضات پیش کروں گا۔

البتہ تمہیداً دو باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ مجھ سے پہلے مولانا زاہد الراشدی صاحب نے دینی نظام تعلیم میں اصلاح کے حوالے سے کچھ باتیں کہی ہیں لیکن انہیں میرے

مقابلے میں ایک advantage حاصل ہے، اور وہ یہ کہ چونکہ وہ دینی مدارس کے نظام سے براہ راست متعلق ہیں، اس لیے اگر وہ اس نظام میں اصلاح یا اس کے نہج میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو وہ کسی حد تک قابل قبول یا کم از کم قابل برداشت ہوتی ہے۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ میں مدارس کا نہیں بلکہ کالج اور یونیورسٹی کا آدمی ہوں، اور دینی مدارس کے لوگ یہ تاثر لے سکتے ہیں کہ یہ کوئی باہر کا آدمی ہے جو ہم پر تنقید کر رہا ہے۔ میں اس تاثر کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں بھی عربی اور اسلامیات کا آدمی ہوں، ساری عمر یہی مضامین پڑھتے پڑھاتے گزری ہے، صرف میدان عمل اور پلیٹ فارم کے بدل جانے سے آدمی ''باہر'' کا آدمی نہیں بن جاتا۔ ہمارا موضوع ایک ہے، مقصد ایک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ مدرسے میں پڑھاتے ہیں اور میں یونیورسٹی میں کام کرتا ہوں۔ چنانچہ میری گزارشات کو کسی باہر کے آدمی کی تنقید یا تنقیص نہ سمجھیے۔ میں بھی آپ ہی میں سے ہوں، آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ کا احترام کرتا ہوں اور آپ کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتا ہوں اور اسی حوالے سے ان پر غور وفکر کرتا ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام میں اصلاح کی بات کرنے والے دو گروہ ہیں۔ ایک تو بیرونی قوتیں اور ان کے مقامی ایجنٹ ہیں جو مدارس میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ اور دوسرے کچھ اندر کے لوگ بھی ہیں جو اس نظام کو بہتر بنانے کے لیے کچھ تغیرات چاہتے ہیں۔ تو ان دونوں کی پوزیشن میں فرق کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ باہر کی قوتیں دینی مدارس کے نظام میں تبدیلی اپنے دین دشمن مقاصد کے تحت چاہتی ہیں، جبکہ ہم لوگ اگر تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو دینی مقاصد کی بہتری کے لیے کرتے ہیں۔ مولانا زاہدالراشدی صاحب یا میں اگر موجودہ دینی نظام تعلیم سے کوئی اختلاف کرتے ہیں تو اس سے مقصود ہرگز اس کی تنقیص یا اسے نقصان پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ یہ کام پہلے سے بہتر اور عمدہ طریقے سے انجام پائے، اور دینی مدارس میں ایسے علما تیار ہوں جو معاشرے میں زیادہ موثر دینی کردار ادا کر سکیں۔ لہٰذا کھرے اور کھوٹے میں فرق ملحوظ رکھیے۔ یہاں تو اب یہ حالت ہے کہ

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

تو یہ بات ذرا ذہن میں رکھیے کہ ہم لوگ مدارس کے خیر خواہ ہیں، تبدیلی کی کوئی بات کرتے ہیں تو پیش نظر مخلصانہ اصلاح ہوتی ہے۔ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جو باہر سے بیٹھ کر توپ وتفنگ سے کام لے رہے ہوں تاکہ خدانخواستہ یہ نظام برباد اور ختم ہو جائے۔

'تربیت' کا مفہوم اور اہمیت

اب میں اپنے اصل موضوع یعنی 'تربیت طلبہ' کی طرف آتا ہوں۔ سب سے پہلے تو یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تربیت کیا ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ جس چیز کو ہم تعلیمی اصطلاح میں 'تربیت' کہتے ہیں، شرعی اصطلاح میں اسے 'تزکیہ' کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے آپ کے سامنے جو آیت کریمہ تلاوت کی، وہ تزکیہ سے متعلق ہے۔ تزکیہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ زك و ہے۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں: ایک کسی چیز کو پاک صاف کرنا اور دوسرے اس کو جلا دینا اور پروان چڑھانا۔ گویا جب ہم تزکیہ نفس کی اصطلاح استعمال کریں گے تو مطلب یہ ہوگا کو نفس کو عقائد واعمال اور اخلاق وکردار کی ساری کمزوریوں سے پاک کرنا اور ان کی جگہ ان خوبیوں کو پروان چڑھانا جو کہ شریعت کو مطلوب ہیں۔ اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، کن اخلاق واوصاف کو پروان چڑھانا ہے اور کن چیزوں سے بچنا ہے؟ اس کا فیصلہ شریعت کرتی ہے۔

اس تزکیہ کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ جتنے پیغمبر بھی اس نے بھیجے، وہ لوگوں کے تزکیے کے لیے ہی بھیجے۔ سورۃ الاعلیٰ میں ہے کہ 'قد افلح من تزکی فذکر اسم ربه فصلی .... ان هذا لفی الصحف الاولی صحف ابراهیم و موسی' یعنی صحف ابراہیم وموسیٰ میں بھی یہی بات کہی گئی تھی کہ لوگوں کی فلاح کا دارومدار تزکیہ (اور عبادت وترجیح آخرت) پر ہے۔ اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ 'اذهب الی فرعون انه طغی فقل هل لك الی ان تزکی' یعنی فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اسے تزکیہ اختیار کرنے کی تلقین کرو۔ (النازعات ۷۹:۱۷) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈیوٹی بھی اللہ تعالیٰ نے یہ لگائی کہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ

کریں۔قرآن حکیم میں یہ بات چار مواقع پر بیان ہوئی ہے۔سورہ جمعہ میں، آل عمران میں اور دو دفعہ سورۂ بقرہ میں۔ایک جگہ پر آپ کی ذمہ داریاں بیان کرتے ہوئے تزکیہ کا ذکر شروع میں ہے اور دوسری جگہ آخر میں،جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو چیز اول و آخر مطلوب ہے، وہ تزکیہ ہی ہے۔ ویسے بھی تعلیم کا مطلب ہوتا ہے علم کا حصول اور کچھ چیزوں کا جاننا۔ظاہر ہے کہ کسی چیز کا علم یا کچھ معلومات کا جان لینا اصل مقصد نہیں ہوتا بلکہ اصل مقصد تو اس علم پر عمل کرنا ہوتا ہے۔مطلب یہ کہ تعلیم سے مقصود بھی تزکیہ ہی ہے۔نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: 'قد افلح من زکاھا وقد خاب من دساھا'۔یعنی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا، وہ کامیاب ہے اور جس نے یہ نہ کیا، وہ ناکام ہے)(الشّمس ۹۱:۹،۱۰) تو تزکیہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ ہماری فلاح کا ضامن ہے۔فلاح کیا ہے؟ فلاح اسلام کا ایک جامع تصور اور اصطلاح ہے۔اس میں دین اور دنیا دونوں کی کامیابی شامل ہے۔کامیابی یہ ہے کہ آدمی آخرت میں سرخرو ہو اور دنیا کی زندگی اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے گزارے۔گویا تزکیہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی ایسی تربیت ہو کہ اس کے لیے اللہ کے احکام کی اطاعت آسان ہو جائے، اور شریعت کی پیروی اس کی طبیعت بن جائے۔

دیکھیے ! انسانی نفس کی جو ساخت اور بناوٹ ہے، اس میں خیر اور شر دونوں شامل ہیں۔ 'فالھمھا فجورھا وتقواھا' (الشّمس ۹۱:۸) یعنی انسان میں اللہ تعالیٰ نے نیکی کے جراثیم بھی رکھے ہیں اور برائی کے بھی۔انسان جس پہلو کو ترقی دیتا ہے، وہی اس کی شخصیت پر غالب آ جاتا ہے۔اس بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو فطرت پر پیدا کرتا ہے لیکن والدین اور ماحول کسی کو یہودی اور کسی کو عیسائی بنا دیتا ہے۔تو ماحول کے ان منفی اثرات کے ازالہ کے لیے انسانی جبلتوں، محرکات، عواطف اور مدرکات، ان سب کی صحیح تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔یعنی ان کی اس طریقے سے نشو ونما کہ خیر کا پہلو بڑھتا جائے اور اس کی نمو ہوتی جائے، جبکہ انسانی شخصیت کا حیوانی پہلو جو فجور کا پہلو ہے، وہ دبتا چلا جائے۔نفس انسانی کے سارے ذہنی، فکری اور جسمانی قویٰ کی ایسی نشو ونما بے حد اہم ہے کیونکہ جب تک آدمی کی صحیح تربیت نہ ہو، وہ نہ اسلام لا سکتا ہے اور نہ اسلامی احکام پر کما حقہٗ عمل کر سکتا ہے۔چنانچہ آپ دیکھیے

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں، جب مسلمانوں پر بہت کڑا وقت تھا، دو آدمیوں یعنی حضرت عمر اور ابوجہل کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی کہ یا اللہ، ان میں سے کسی ایک کو قبول اسلام کی توفیق عنایت فرما۔ تو ایک کے بارے میں دعا قبول ہوگئی جبکہ دوسرے کے بارے میں نہیں ہوئی کیونکہ قبول ہدایت کی جو صلاحیت سیدنا عمرؓ میں پائی جاتی تھی، ابوجہل اس سے محروم تھا۔ تو نفس کی سعادت کا مدار اس کے تزکیے پر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس تربیت کا وسیلہ بھی بتا دیا ہے یعنی تعلیم کتاب۔ اس کی بنیاد قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم علم کا ذریعہ بھی ہے اور تزکیہ کا بھی۔ جب علم اور تزکیہ دونوں کی بنیاد قرآن پر ہو اور حکمت کے ساتھ ہو تو وہ شخصیت وجود میں آتی ہے جو قرآن کو اور اسلام کو مطلوب ہے۔

اس تربیت کو اگر آپ تعین کے ساتھ جاننا چاہیں کہ یہ کیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں: ایک معصیت سے بچنا اور دوسرے درجہ 'احسان' کا حصول۔ یعنی تربیت کا حاصل یہ دو چیزیں ہیں: ایک یہ کہ آدمی اللہ کی معصیت سے بچ جائے، اس کی اطاعت کے قابل ہو جائے اور اس کے احکام کی پیروی آسانی سے اور خوشی سے کرنے لگ جائے۔ دوسرے یہ کہ آدمی احکام شریعت پر عمل کرتے ہوئے انہیں بہترین طریقے سے سرانجام دے۔ 'احسان' کا مطلب ہے کسی کام کو اپنی بہترین صورت میں اور کمال کے ساتھ کرنا۔ حدیث جبریل میں یہ بات یوں بیان کی گئی ہے کہ 'ان تعبد الله کانك تراه'۔ اس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی کہ احسان کا تعلق صرف عبادت سے ہے۔ اول تو عبادت کا مطلب عربی زبان میں وسیع تر ہے۔ پھر دوسری روایت میں ان تعبد الله کے بجائے ان تعمل لله کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ساری زندگی میں اطاعت کے جتنے بھی کام ہوں، وہ اعلیٰ ترین درجے کے ہوں۔ گویا احسان کا مطلب ہے حصول کمال یا excellence۔

تربیت سے تغافل کے اسباب

اب ذہن میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ تربیت اتنی اہم ہے اور اس کو تعلیم کی اصل غایت کی حیثیت حاصل ہے تو پھر ہمارے تعلیمی نظام میں اس سے صرف نظر کیوں کر لیا گیا ہے اور

اس کو عملاً اہمیت کیوں نہیں دی جاتی ؟اس تغافل کے بہت سے نظری اور عملی اسباب ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ والدین کو بچوں کی تربیت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ اچھا کھلانے پلانے اور اچھا پہنانے کے ساتھ بچوں کو سکول کالج یا مدرسے میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا جائے، اس سے زیادہ ان کو ان کی تعمیر سیرت وکردار کی کوئی فکر نہیں۔ گویا جسمانی پرورش اور ظاہری ضروریات کی فراہمی سے زیادہ وہ اپنی کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ جو چیز بچوں کی ضروریات کے حوالے سے سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ وہ ان کی تعمیر سیرت وکردار کی خبر رکھتے، اس کے لیے پریشان ہوتے، کوشش اور جدوجہد کرتے اور خود اس کے لیے وقت نکالتے۔ آج کل بچے سکولوں میں جاتے ہیں، شام کو واپس آتے ہیں تو ٹیوشن کے لیے بھجوا دیے جاتے ہیں، رات کو ٹی وی کھول کر والدین خود بھی بیٹھ جاتے ہیں اور بچوں کو بھی ساتھ بٹھا لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ والدین بچوں کے لیے کوئی وقت نہیں نکال پاتے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ والدین کو اس بات کا احساس ہی نہیں کہ بچے کی تربیت بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اساتذہ بھی طلبہ کی تربیت کی ذمہ داری سے غافل ہو گئے ہیں، حالانکہ ان کا اصل کام پڑھا دینا نہیں، بلکہ تربیت کرنا ہے۔ خاص طور پر ہمارے ماحول میں اساتذہ کی یہ ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ماحول میں ٹی وی اور وی سی آر کی صورت میں بگاڑ پیدا کرنے والے عوامل پہلے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ان عوامل میں سے ایک بری صحبت بھی ہے۔ غربت بھی ایک مسئلہ ہے۔ والدین دو اور دو چار کے چکر میں رہتے ہیں، دال روٹی کی فکر کرتے ہیں، صبح سے شام تک ان کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی کہ دیکھیں کہ بچے کس حال میں ہیں۔ بعض اوقات والدین کی ناچاقی بھی بچوں کے بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے۔ تو تعلیمی اداروں، خاص طور سے دینی تعلیمی اداروں میں طلبہ کی تربیت پر توجہ دینے کی بے حد ضرورت ہے۔

تربیت کی اقسام

تربیت کو ہم کئی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ دینی تربیت، فکری وعلمی تربیت، انتظامی تربیت اور جسمانی تربیت وغیرہ۔ یہ سارے تربیت کے مختلف پہلو ہیں اور باہم متجاوز بھی ہیں۔ اب ہم ان

پر ذرا تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

۱۔ دینی تربیت:

دینی تربیت میں پورے دین کو شامل سمجھنا چاہیے۔ ہمارا جو دین ہے، اس کے مشمولات کو ہم چار بڑے شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں: ایک عقائد، دوسرے عبادات، تیسرے اخلاق و آداب اور چوتھے معاملات۔ عقائد ظاہر ہے کہ ہر چیز کی بنیاد ہیں۔ عبادات کا تعلق بندے اور رب کے درمیان ہے، جبکہ اخلاق و آداب اور معاملات کا تعلق انسانوں کے مابین مسائل سے ہے۔ ان مسائل سے ہمارے دین کا ایک بڑا حصہ متعلق ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مدارس میں پڑھائے جانے والے مواد کا غالب حصہ فقہ سے متعلق ہوتا ہے، اس لیے کہ فقہ میں زندگی کے روزمرہ مسائل سے بحث ہوتی ہے اور انسانوں کو جن معاملات سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ فقہ میں زیر بحث آتے ہیں۔

دینی تربیت کے بارے میں ہمارے ہاں تعلیمی اور تربیتی حلقوں میں کئی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں تصوف کے نام سے جو ادارہ تربیت اور تزکیہ کے لیے وجود میں آیا، اس میں اس وقت ہمارے ہاں زیادہ زور ذکر اور عبادات پر دیا جاتا ہے۔ تھوڑی سی توجہ اخلاق پر دے دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ان چیزوں کی اہمیت کم نہیں کر رہا، لیکن ایک متوازن تربیت کی ضرورت ہے۔ عبادات یقیناً اہم ہیں لیکن کیا معاملات غیر اہم ہیں؟ کیا جھوٹ بولنا غیر اہم ہے؟ وعدہ خلافی کرنا غیر اہم ہے؟ بیوی بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا غیر اہم ہے؟ یہ بھی اسی طرح خدا اور رسول کے حکم ہیں جیسے پہلی چیزیں۔ تو تربیت میں کچھ پہلوؤں کو اہمیت دینا اور کچھ کو نہ دینا یہ دینی لحاظ سے ایک غیر متوازن رویہ ہے۔

عبادات کی تربیت، (مثلاً نماز وقت پر اور باجماعت ادا کرنا): اس میں یہ ذہن میں رہے کہ چونکہ مدارس کا ماحول دینی ہوتا ہے اس لیے اس لحاظ سے وہاں بعض پہلوؤں پر کم توجہ کی ضرورت ہوگی اور بعض دوسروں پر زیادہ کی۔ عام تعلیمی اداروں میں عبادات کے حوالے سے دینی تربیت کی زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے کیونکہ وہاں مساجد نہیں ہوتیں، طہارت خانے نہیں

ہوتے، وضو کی جگہ نہیں ہوتی، وغیرہ۔

جب ہم تربیت کی بات کرتے ہیں، خصوصاً دینی لحاظ سے تو روزمرہ زندگی کے آداب پر بھی خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، مثلاً آداب میں سے ایک یہ ہے کہ وقت پر کام کیا جائے۔ میں نے دیکھا ہے کہ دینی مجالس میں اس چیز کا اہتمام نہیں کیا جاتا حالانکہ نماز میں ہمیں سب سے پہلے یہی بات سکھائی جاتی ہے۔ جماعت کا وقت ہوتے ہی لوگ گھڑیاں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اورالحمدللہ یہ مشاہدہ ہے کہ کم ازکم نماز میں ہم وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہماری عادت کیوں نہیں بنتی؟ ہم نماز میں تو وقت کی پابندی کرتے ہیں، اس کے بعد کیوں نہیں کرتے؟ نماز میں اگر یہ شریعت کا حکم ہے تو باہر کیوں نہیں؟ نماز میں حکم ہے کہ صف آگے پیچھے نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ہم میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں، خلا نہ ہو، صف ٹیڑھی نہ ہو، یہ خوبیاں جو شریعت نماز میں پیدا کرنا چاہتی ہے، وہ باہر کی زندگی میں کیوں منتقل نہیں ہوتیں؟

۲۔ فکری و علمی تربیت

فکری و علمی تربیت میں حریت فکر، تحقیق، تقریر و تحریر کی مشق، لائبریری کا استعمال، مطالعاتی و تفریحی سفر وغیرہ شامل ہیں۔ سب سے پہلے حریت فکر کو لیجیے۔ ممکن ہے میری یہ بات آپ کو قابل ہضم نہ لگے، لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ حریت فکر کی تربیت بھی بالکل دینی اساس رکھتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے، جن کی ایک ایک بات ہمارے لیے حجت ہے، ہمیں اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ خود آپ نے اپنے صحابہ میں اس چیز کی حوصلہ افزائی کی۔ بدر کے موقع پر دیکھ لیجیے، جب حضرت حباب بن منذرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ! جس جگہ آپ نے فوج کو اترنے کا حکم دیا ہے، کیا وہ وحی پر مبنی ہے؟ آپ نے فرمایا، نہیں۔ تو کہا کہ یہ جگہ تو مناسب نہیں۔ غزوۂ احزاب میں بھی ایسے ہی ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ کچھ دے دلا کر یہودیوں سے معاملہ طے کر لیا جائے کیونکہ باہر دشمن ہے، یہ کہیں اندر سے وار نہ کر دیں۔ انصار کے سرداروں کو پتہ چلا تو انہوں نے کہا کہ اگر وحی کی بنیاد پر حکم ہے تو سر تسلیم خم ہے لیکن اگر محض تجویز ہے تو ہم اتفاق نہیں

کرتے۔ آپ نے ان کی بات مان لی۔ یہ تو خیر بڑے معاملات ہیں۔ گھر کی خادمہ حضرت بریرہؓ کا واقعہ تو آپ کے علم میں ہوگا۔ اس کا خاوند پاگل ہوا پھرتا تھا۔ روتا ہوا اس کے پیچھے گلیوں میں بھاگتا تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کے نکاح میں رہے، کیونکہ بریرہؓ کے آزاد ہونے کی وجہ سے نکاح ختم ہو گیا تھا۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کی تو آپ نے بریرہ کو بلایا اور کہا کہ مغیث کے ساتھ نکاح برقرار رکھو۔ اس نے کہا کیا یہ آپ کا حکم ہے؟ فرمایا نہیں، محض سفارش ہے۔ تو کہنے لگی معاف کیجیے، میں اس کے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔

تو بلاشبہ کمال درجے کی اطاعت کا تصور بھی شریعت میں موجود ہے، وہ اپنی جگہ، لیکن یہ چیز اس کی نقیض نہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو اس کا فرق وقتاً فوقتاً سمجھاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو دیکھا کہ کچھ صحابہ کھڑے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ جو جہاں تھا، وہیں بیٹھ گیا۔ جو لوگ دروازے میں تھے، وہ بھی وہیں بیٹھ گئے اور راستہ بند ہو گیا۔ آپ نے بعد میں کہا کہ بھائی راستہ تو چھوڑ دو۔ صحابہ کی اطاعت کا یہ حال تھا اور ظاہر ہے کہ اگر نبی کی اطاعت بھی پیچ پیچ کے ساتھ کریں تو وہ اطاعت کیا ہوئی؟ غیر مشروط اطاعت مطلوب ہے اور صحابہ کرام نے ہمارے لیے اس کے بہترین نمونے چھوڑے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہمارا دین فکری حریت کا بھی علمبردار ہے۔ یہ چیز اللہ و رسول کی غیر مشروط اطاعت کی نقیض نہیں۔ اطاعت غیر مشروط اور پورے جذبے اور شدت کے ساتھ کرنی چاہیے، لیکن دین ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ ہم اپنے دل و دماغ کے دروازے بند کر لیں اور سوچنا چھوڑ دیں۔

اب اگر آپ مدارس کے نظام تعلیم کے بارے میں حریت فکر کا عملی اطلاق کرنا چاہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ تین مسائل آپ کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ ایک مقاصد تعلیم، دوسرے نصاب تعلیم، اور تیسرے دین میں مسلک کا مقام۔ ممکن ہے یہ موضوع سے کچھ تجاوز ہو لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ آیئے چند منٹ کے لیے ان پر کچھ غور کر لیں۔

مقاصد تعلیم:

جب ہم نظام تعلیم کی بات کرتے ہیں تو نصاب، کتابوں، تعلیمی ماحول اور بہت سی دیگر

باتوں سے پہلے جو بات زیر بحث آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس تعلیمی نظام کے مقاصد کیا ہیں؟ ہمارے مدارس میں ایک بات مشہور ہے اور وہ یہ کہ ہم نے بس علما اور مولوی پیدا کرنے ہیں جو مسجدیں سنبھالیں اور مدرسے چلائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ناقص اور کمزور بات ہے۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں کبھی ثنویت نہیں رہی، اس میں ہمیشہ وحدت رہی ہے۔ دینی نظام تعلیم کا یہ محدود ہدف دراصل گزشتہ صدی میں اس وقت کے حالات کے تناظر میں طے کیا گیا تھا۔ درس نظامی جب ہندوستان میں رائج تھا تو سی ایس پی افسر پیدا کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے انہی مدارس سے فارغ ہونے والے لوگ تحصیل دار اور کلکٹر لگتے تھے، جج اور قاضی بھی وہی بنتے تھے، ڈاکٹر اور طبیب بھی وہی ہوتے تھے۔ ملک کا نظام چلانے کے لیے ساری بیوروکریسی انہی مدارس سے آتی تھی۔ انگریزوں کے تسلط اور قبضے کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اس تعلیمی نظام کی بساط بھی لپیٹ دی گئی۔ مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں مزاحمت کی تو چھ چھ سو علما کو ایک دن میں درختوں کے ساتھ پھانسی دی گئی۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان کو پوری طرح کچل دیا گیا۔ فارسی جو اس وقت کی قومی زبان بھی تھی اور سرکاری بھی، اس کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان کے طور پر نافذ کر دیا گیا، تو فارسی عربی پڑھنے والے بیروزگار ہو گئے۔ مثل مشہور ہوگئی کہ پڑھیں فارسی بیچیں تیل۔ ان کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ معاشرے میں ان کا کوئی ذریعہ روزگار نہیں تھا، کیونکہ انگریزی آ گئی تھی۔ اس صورت حال میں کچھ علما نے سوچا کہ اب حکومت تو ہمارے پاس رہی نہیں، پہلے بڑے بڑے وقف ہوتے تھے اور حکومتیں وسائل مہیا کرتی تھیں۔ اب یہ تعلیمی نظام ختم ہو گیا ہے اور انگریز نے سارا نظام بدل دیا ہے تو اب امت کا مستقبل کیا ہوگا؟ انہوں نے سوچا کہ ہمارا اجتماعی نظام تو باقی نہیں رہا تو کم از کم ہمارا یہ جو مساجد کا نظام ہے، اور نکاح طلاق کے جو مسائل ہیں، اور خوشی غمی کی جو رسمیں ہیں تو انفرادی اور معاشرتی زندگی کے ان دائروں میں ہی میں دین کو بچا لیا جائے، اگرچہ کسی کونے کھدرے میں لگ کر ہی بچایا جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی۔

لیکن یہ صورت حال ۱۹۴۷ء میں ختم ہوگئی۔ اب ہم نہ دارالحرب میں ہیں اور نہ انگریز ہم پر

حکمران ہیں۔ اب تو آپ کا اپنا ملک ہے تو آپ پہلے والی پالیسی کیسے رکھ سکتے ہیں؟ لہٰذا اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک مسلم معاشرے میں ہمیں صرف ایسے عالم دین ہی پیدا نہیں کرنے ہیں جو مدرسے اور مسجدیں سنبھالیں۔ یقیناً یہ بھی سنبھالنے چاہییں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس معاشرے کا کیا قصور ہے کہ اس کو ایسا جج نہ ملے جو دین جانتا ہو؟ مسلمانوں کی ریاست ہے تو جج آخر ایسا کیوں ہو جس کو انگریزوں کا قانون تو یاد ہو لیکن وہ شرعی قانون سے واقف نہ ہو؟ ہمارے ہاں وکیل ہیں جو قانون کی تشریح کرتے ہیں۔ ان سے پہلے مفتی ہوتے تھے، اب وکیل آ گئے ہیں۔ تو ان وکیلوں کو اسلامی قانون کی تعلیم دینا کس کا کام ہے؟ کیا وہ دینی کام نہیں؟ کیا یہ سارا نظام ایسے ہی چلتا رہے؟ ہم اس میں کوئی حصہ نہیں لیں گے؟

اس وقت دینی مدارس میں ایک اندازے کے مطابق حفظ و ناظرے کے درجات کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ دو لاکھ طالب علم پڑھتے ہیں جبکہ گزشتہ سال کے اکنامک سروے آف پاکستان کے اعداد و شمار کے مطابق پرائمری سکول میں داخلہ لینے والے پاکستانی بچوں کی تعداد تقریباً ۲ کروڑ ہے۔ اب یہ کون سا دین ہے یا دین کی کون سی حکمت عملی ہے کہ آپ دو لاکھ بچوں کو تو پڑھا رہے ہیں اور دو کروڑ کو بھولے ہوئے ہیں؟ ان کو دین کون سکھائے گا؟ کیا وہ مسلمانوں کے بچے نہیں؟ بات اس وقت حکومت یا غیر حکومت کی نہیں ہو رہی۔ سوال یہ ہے کہ اہل دین، جو لوگوں کو دین سکھانا چاہتے ہیں، ان کی ان دو کروڑ بچوں تک اپروچ ہی نہیں۔ ان بچوں کو پڑھانے والے اساتذہ میں آپ کے استاد کتنے ہیں؟ ان استادوں کی تربیت میں آپ کا کتنا ہاتھ ہے؟ آپ کے پیش نظر تو دین کی خدمت ہے، آپ تو دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں، معاشرے میں دین دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ کا مقصد تعلیم یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ صرف مدرسے کے مولوی پیدا کریں؟ اس ملک کو چلانے والے لوگ جو مسلمان ہیں اور آپ کے بھائی ہیں، ان کو دین سکھانا کیا آپ کی ذمہ داری نہیں؟ آپ اس نکتے پر غور فرمائیں کہ اہل دین کو صرف مدرسے اور مسجد تک محدود نہیں رہنا ہے۔ اگر آپ اس معاشرے میں اسلام چاہتے ہیں اور دین ہی کی خدمت کے لیے آپ نے ادارے بنائے ہیں، تو آپ کا دائرہ کار محدود نہیں ہونا چاہیے۔ حالات کے بدلنے کی وجہ سے جو

بنیادی تبدیلی آئی ہے، اس کے لحاظ سے آپ کو مقاصد تعلیم میں وسعت پیدا کرنی چاہیے۔

نصاب تعلیم:

جب آپ مقاصد تعلیم میں توسیع کریں گے تو نصاب خود بخود بدل جائے گا۔ معاف کیجیے گا، آپ کے لیے یہ بات شاید نئی ہو۔ ہم لوگ جو کالج یونیورسٹی میں ہیں، ہمارے لیے یہ بات نئی نہیں ہے۔ ہر سال یونیورسٹی میں کلاسیں شروع ہونے سے پہلے پروفیسروں کی میٹنگیں ہوتی ہیں جن میں پروفیسر یہ طے کرتا ہے کہ اس نے کیا پڑھانا ہے۔ مثلاً اصول فقہ ایک مضمون ہے تو میرے ذمے یہ ہے کہ میں نے اصول فقہ پڑھانا ہے۔ اب اس میں کیا پڑھانا ہے، تو وہ میری صواب دید پر منحصر ہے۔ یونیورسٹی مجبور نہیں کرتی کہ فلاں کتاب پڑھاؤ۔ بلکہ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ میں جب شریعہ اکیڈمی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد) میں تھا اور ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے ساتھ کام کرتا تھا تو ہمارے پروگرام مینیجر ایک سول جج تھے جو آج کل ایڈیشنل سیشن جج ہیں۔ میں فقہ القرآن والسنۃ پڑھاتا تھا تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ تم فلاں چیز پڑھاؤ۔ مجھے اس بات پر غصہ آیا اور میں نے ڈاکٹر غازی کو ان کی تحریری شکایت کی کہ یہ کون ہوتے ہیں مجھے بتانے والے کہ میں کیا پڑھاؤں اور کیا نہ پڑھاؤں؟ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا کہ جاؤ اور ڈاکٹر امین سے معذرت کرو۔ یہ تمہارا کام نہیں کہ تم یونیورسٹی کے استاد کو یہ بتاؤ کہ کیا پڑھانا ہے۔

تو نصاب کوئی غیر متبدل چیز نہیں ہوتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نصاب صرف قرآن مجید تھا۔ بعد میں لوگوں نے حدیثیں بھی پڑھنا شروع کر دیں۔ اگلی صدی میں فقہ بھی شامل ہو گئی۔ اس وقت اصول فقہ نہیں تھے۔ اس سے اگلی صدی میں اصول کی تعلیم بھی شروع ہو گئی۔ جب یونانی علوم کا ریلا آیا تو منطق بھی شامل ہو گئی۔ تو نصاب کوئی مقدس گائے نہیں ہوتی۔ یہ ہمیشہ زمانے اور معاشرے کی ضروریات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ نصاب کے کچھ اجزا مثلاً قرآن وسنت، یقیناً کبھی تبدیل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح چونکہ ہمارے دینی مآخذ عربی میں ہیں، تو عربی زبان بھی نہیں بدلے گی۔ لیکن، معاف کیجیے، فارسی کو کوئی تقدس حاصل نہیں۔ اس کی اس وقت یقیناً ضرورت تھی جب اسے قومی زبان کی حیثیت حاصل تھی، یہ اس وقت معاشرتی زبان بھی

تھی۔اس وقت جونہیں پڑھتا تھا، تیل بیچتا تھا، اسے روزگار نہیں ملتا تھا۔ یہ ذریعہ اظہار تھی۔اب فارسی ذریعہ اظہار نہیں ہے۔تو کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں اس لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔نصاب کو تقدس حاصل نہیں ہوتا۔نصاب سے مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ ایسے موثر اور متبحر علما تیار کیے جائیں جو معاشرے تک بہترین طریقے سے دین پہنچا سکیں، دین کی خدمت کر سکیں، لوگوں کے قول وعمل کو شریعت کے مطابق ڈھال سکیں۔

اب آپ ہماری موجودہ ضروریات کے لحاظ سے اس نصاب پر نظر ڈالیں تو کئی خامیاں محسوس ہوں گی۔مغرب اور امریکہ کے ایجنڈوں کو چھوڑیے، خود سوچیے کہ کیا ہمارے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس دنیا کو سمجھیں؟ اگر امام غزالی کی یہ مجبوری تھی کہ وہ یونانی فلسفہ پڑھیں اور پھر ''تہافت''، لکھیں تو آج ہماری مجبوری یہ کیوں نہیں ہے کہ ہم پہلے مغرب کا فلسفہ پڑھیں اور پھر اس کی تردید کریں؟ آپ اگر مغرب کا فلسفہ سمجھتے ہی نہیں تو اس کا رد کیسے کریں گے؟ اس لیے ان علوم کو جاننا جو اس وقت دنیا میں مروج ہیں، خود ہماری ضرورت ہے۔جس طرح قدیم زمانے میں یونانی فکر گمراہیوں کا سرچشمہ تھی، آج اسی طرح مغربی فکر گمراہیوں کا منبع ہے۔آپ کیسے کہتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں؟ جب تک آپ انگریزی نہیں پڑھتے، آپ کو پتہ کیسے چلے گا کہ آپ کے دشمن کی سوچ کیا ہے اور اس کا رد کیسے کرنا ہے؟

اسی طرح قرآن مجید کو اس نصاب میں وہ مرکزی حیثیت حاصل نہیں جو اسے حاصل ہونی چاہیے۔معاف کیجیے گا، آپ کو حدیث کا دورہ تو پڑتا ہے، قرآن کا کیوں نہیں پڑتا؟ کیا قرآن حدیث سے کم اہم ہے؟ پھر قرآن وحدیث کو آپ فقہی تناظر میں اور فقہی زاویہ نگاہ سے پڑھاتے ہیں۔قرآن وحدیث کے پیغام، فلسفہ اور ان کی حکمت کے بہت کم پہلو زیر غور آتے ہیں۔فقہی مباحث میں بھی غلط ترجیحات قائم کر لی گئی ہیں۔ بخاری کی ایک حدیث رفع یدین پر آ گئی تو حنفی نقطہ نظر کی وضاحت میں استاد چھ دن یہ ثابت کرنے پر صرف کرے گا کہ رفع یدین نہیں کرنا چاہیے۔اس کے مقابلے میں جب معاملات سے متعلق کوئی حدیث آئے گی تو ترجمہ پڑھ کر فارغ ہو جائیں گے۔آخر کیا قصور ہے اس حدیث کا؟ عربی زبان، جیسا کہ آپ بھی تسلیم کریں گے کہ

دینی مدارس کے طلبہ کو نہ لکھنی آتی ہے اور نہ بولنی۔ تو ان سب حوالوں سے نصاب اور منہج تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

مسلک کا مقام:

تیسری چیز یہ ہے کہ ہم نے مسالک کو دین بنالیا ہے۔ معاف کیجیے گا، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اپنا مسلک چھوڑ دیجیے۔ مسلک ہونا چاہیے۔ فقہ ہو یا کلام، ہر آدمی کا ایک مسلک ہوتا ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، لیکن وہ مسلک دین نہیں ہوتا، وہ اجتہادی مسلک ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک رائے کی ہوتی ہے۔ حضرت قائداعظم سے کسی نے پوچھا کہ آپ شیعہ ہیں یا سنی؟ وہ وکیل آدمی تھے اور ہوشیار تھے، انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شیعہ تھے یا سنی؟ سوال کرنے والا خاموش ہو گیا کیونکہ اس کے ذہن میں شرارت تھی۔ تو عرض یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مسلکی تقسیم ضرورت سے زیادہ شدید ہے اور وہ بعض حلقوں میں خونی تقسیم بن گئی ہے۔ سیکڑوں آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اس کے اسباب زیادہ تر دوسرے ہیں، اصلاً مسلکی اور فقہی اختلافات بنیاد نہیں، لیکن نور بشر کے جھگڑوں میں مسجدیں دھلتی ہم نے بھی دیکھی ہیں۔ حالانکہ اگر غور کریں تو ہمارے ملک میں مسلکی اختلافات کی کوئی بڑی بنیاد نہیں، اس لیے کہ غالب اکثریت حنفی ہے۔ بریلوی بھی حنفی ہیں اور دیوبندی بھی۔ اہل ظاہر یا اہل حدیث بالکل تھوڑے ہیں، پانچ یا سات فی صد ہوں گے۔ تو پھر جھگڑے کیوں؟ اس وقت شیعہ کو چھوڑ کر باقی چاروں وفاقوں کے نصاب میں کوئی خاص فرق نہیں۔ چھوٹی موٹی کتابوں کا فرق ہے۔ حتیٰ کہ اہل حدیث بھی فقہ میں ہدایہ ہی پڑھاتے ہیں۔ اس کے باوجود نصاب کیوں ایک نہیں بنتا؟ وفاق کیوں ایک نہیں بنتا؟ میں عرض کروں گا کہ یہ وفاقوں کی تقسیم بھی اسٹیبلشمنٹ کی قائم کردہ ہے۔ وہ علما میں تفریق ڈالے رکھنا چاہتی ہے۔ ان کے اندر اتحاد نہیں دیکھنا چاہتی۔ ضیاء الحق چاہتا تو پانچ وفاقوں کی اجازت نہ دیتا، دو کی دیتا تو سب اہل سنت مجبور ہوتے کہ ایک ہی نظام کے تحت کام کریں۔ معاف کیجیے گا، اس معاملے میں علما کو بالغ نظری کا ثبوت دینا چاہیے۔

تحقیق:

حریت فکر کی بحث سمیٹنے کے بعد اب آیئے فکری وعلمی تربیت کے دوسرے اجزا کی طرف۔ ان میں سرفہرست تحقیق ہے۔ ہمیں دینی علوم میں تحقیق کی ضرورت ہے اور اس تحقیق میں بھی تخلیقیت کی ضرورت ہے۔ مکھی پر مکھی مارنا کوئی کام نہیں۔ ہمارے ایک نوجوان دوست، جو لاہور کی ایک جامعہ میں استاد ہیں، مجھ سے کہنے لگے کہ میں نے لکھنے پڑھنے کا کام شروع کیا ہے، میرے لیے دعا کریں۔ میں نے کہا ماشاءاللہ بڑی خوشی کی بات ہے، آپ کیا لکھ رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ دعاؤں کا ایک مجموعہ تیار کر رہا ہوں۔ میں نے کہا، اس کے بعد کیا منصوبہ ہے؟ کہنے لگے کہ پھر نماز پر ایک کتاب لکھوں گا۔ میں نہیں کہتا کہ یہ دین کی خدمت نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ بار بار ایک ہی قسم کے موضوعات پر کام کرتے چلے جانا کیا صلاحیتوں اور وقت کا درست استعمال ہے؟ میں آپ کو اپنا ذاتی واقعہ سناتا ہوں۔ میں نے لندن یونیورسٹی کے سکول آف اورئینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کے ایک انگریز پروفیسر سے خط وکتابت کی کہ میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ تم مجھے ان موضوعات کی ایک فہرست بھجواؤ جن پر تم کام کرنا چاہتے ہو۔ میں نے جو فہرست بھجوائی اس میں پہلے نمبر پر میں نے جو موضوع لکھا، وہ وہی تھا جس پر میں نے سعودیہ میں ماجستیر میں مقالہ لکھا تھا، یعنی التشریع الاسلامی والغربی۔ چنانچہ میں نے پروفیسر صاحب کو لکھا کہ میں اجتہاد اور مغرب میں قانون سازی کے تقابلی مطالعے کے موضوع پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس انگریز مستشرق نے مجھے جواب میں لکھا کہ تم اجتہاد پر کیا نیا کام کر سکتے ہو؟ یہ تو رٹا رٹایا موضوع ہے۔ میں نے جب اصرار کیا کہ یہ موضوع مجھے پسند ہے اور میں اسی پر کام کرنا چاہتا ہوں تو اس نے کہا کہ تم دو باتیں بتاؤ۔ ایک یہ کہ مغربی قانون کا تمہارا کس حد تک مطالعہ ہے؟ اور دوسرے تم مجھے سکوپ آف اجتہاد یعنی اجتہاد کے دائرہ کار پر چار صفحے کا ایک مضمون لکھ کر بھیجو۔ میں نے جتنا زور لگا سکتا تھا، لگا کر مضمون لکھا اور اس کو بھیج دیا۔ اس نے لکھا کہ تمہارا مغربی قانون کا مطالعہ کمزور ہے، اس سطح کا نہیں ہے کہ تم اس میں پی ایچ ڈی کر سکو، اور دوسری بات یہ کہ تم نے اجتہاد کا جو سکوپ لکھا ہے، وہ مجھے اپیل نہیں کرتا۔ اس میں تم آخر کیا نئی بات کر سکو گے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ

ہم چیزوں کو ری پروڈیوس کر رہے ہیں۔ جتنا لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیں، کوئی بات نئی نہیں ہے۔ کوئی نئے مسائل نہیں ہیں جن کو زیر بحث لایا گیا ہو۔ تو جب تک آپ تخلیقیت کی طرف نہیں آئیں گے، اسلامی علوم میں تحقیق کا خلا پر نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی ایک تحریر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے جس میں ''اسلامی علوم میں تحقیق کیسے کی جائے؟'' کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تحقیق کے لیے لائبریری بھی ایک ناگزیر ضرورت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں مدارس میں لائبریریاں نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو طلبہ کو ان میں جاتے اور استفادہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ لاہور کے بڑے مدارس میں نے دیکھے ہیں۔ ان میں کوئی علمی رسائل نہیں آتے، حتیٰ کہ اخبار تک نہیں آتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک لازمی لائبریری پیریڈ ہونا چاہیے تاکہ طلبہ کتب خانے میں وقت گزاریں۔ ان کو یہ تربیت دی جائے کہ کیٹلاگ کیسے استعمال کرنی ہے، کتاب کیسے ڈھونڈنی ہے۔ اسی طریقے سے اردگرد کی دنیا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے انہیں مطالعاتی دورے کروانے چاہییں۔ انڈسٹریوں میں جانا چاہیے۔ اپنے مدرسے کے ماحول سے باہر نکل کر دنیا اور اس کے ہنگاموں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے طلبہ کی تربیت کرنا چاہتے ہیں، ان کے ذہنی افق کو وسیع کرنا چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ہوگا۔ مجتہد اور مفتی کی شرائط میں سے ایک لازمی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات کو جانتا ہو جن میں اس نے شریعت کا حکم دریافت کرنا ہے۔ جو آدمی اس ماحول کو ہی نہ سمجھتا ہو جس میں اس نے اجتہاد کرنا ہو تو وہ اجتہاد کا اہل کیسے ہوگا؟ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے کچھ عرصہ پہلے ماہنامہ الشریعہ میں یہ بات لکھی کہ ان کے سامنے کسی مدرسے کے مفتی صاحب کے سامنے بنک کے کسی معاملے کے متعلق استفسار آیا تو انہوں نے مولانا سے پوچھا۔ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے تو بنکاری نظام اور اس کی تفصیلات کا پتہ نہیں کیونکہ میں نے مغربی نظام معیشت کا مطالعہ نہیں کیا، لہٰذا میں تو اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ غرض یہ کہ ہمیں ذہنی وسعت پیدا کرنے کے لیے فکری سطح پر کچھ کام کرنے چاہییں۔

تقریر وتحریر کی مشق:

علم وتحقیق کی تربیت کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت وتبلیغ کے لیے تحریر اور تقریر کی بھی تربیت ہونی چاہیے۔ دینی مدارس میں تحریر کی صلاحیت کو نشو ونما دینے کے لیے کچھ نہیں کیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیکھیے۔ یونیورسٹی کا ہر شعبہ اپنا ایک میگزین شائع کرتا ہے اور طلبہ کو ان میں لکھنے کے لیے مقابلے کرنے پڑتے ہیں۔ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنو کی مثال لیجیے۔ وہاں کے فارغ التحصیل فصیح وبلیغ عربی میں تقریر اور تحریر پر قادر ہوتے ہیں جبکہ ہمارے مدارس میں شاذ ونادر ہی ایسے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ہم نے اکثر خطیبوں کو دیکھا ہے کہ وہ اردو بولتے ہوئے غلطیاں کرتے ہیں کیونکہ وہ اردو کا مطالعہ نہیں کرتے۔ تکمیل تعلیم کے بعد کتابیں نہیں پڑھتے۔ مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔ تحریر کی مشق ہونی چاہیے۔ دین بیزار لوگ روز بے ہودہ مضامین کے انبار لگائے جا رہے ہیں اور ان کی تحریریں بکثرت ہمارے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ ان کا جواب دینے کے لیے علما موجود نہیں ہیں اور ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کی تحریر اچھی ہو۔

میں نے علما کی ایک مجلس میں یہ بات کہی جو سب نے مانی۔ میں نے کہا کہ میں نے لاہور کے مختلف علاقوں ڈیفنس، گلبرگ، اقبال ٹاؤن، ماڈل ٹاؤن وغیرہ میں مسجدوں میں جا کر جمعہ کے خطبے سنے ہیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ۹۰ فیصد لوگ دوسری اذان کے وقت مسجد میں آتے ہیں یعنی وہ تقریر سننے نہیں آتے بلکہ نماز پڑھنے آتے ہیں۔ آخر لوگ کیوں علما کی تقریر نہیں سننا چاہتے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ اہل دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس معاشرے کو دین کے مطابق ڈھالیں۔ اگر وہ یہ نہیں کرتے تو وہ ناکام ہیں۔ تو علما کو موثر ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں کہ لوگ ان کی تقریر ہی نہ سننے آئیں، ان کی فریکونسی اور ہو اور جو دو کروڑ بچے دوسرے تعلیمی اداروں سے پڑھ کر نکل رہے ہیں، ان کی فریکونسی اور ہو۔ وہ اور طرح سے سوچتے ہوں اور ہمارے علما دوسری طرح سے سوچتے ہوں۔

۳۔ انتظامی تربیت

اسی طریقے سے انتظامی تربیت بھی ہونی ہے تاکہ طلبہ میں لیڈر شپ کی کوالٹی پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے طلبہ کو مختلف انتظامی کاموں میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً تقریبات کا انتظام ان

کے سپرد کیا جا سکتا ہے اور مختلف ذمہ داریاں ان کے مابین تقسیم کی جا سکتی ہیں۔تقریب کا انتظام کیسے کرنا ہے، اس کی ضروریات کیا ہیں، اس طریقے سے انہیں تربیت دیں۔اس میں وقت کی پابندی کا بھی اہتمام انہیں سکھائیں۔اگر تقریب کے آغاز کا وقت دس بجے طے کیا گیا ہے تو اسے دس بجے ہی شروع ہونا چاہیے۔اس تربیت کی عملی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔

انتظامی تربیت سے خود اعتمادی آتی ہے، سلیقہ اور قرینہ آتا ہے۔نظم وضبط پیدا ہوتا ہے۔ مدارس میں انتظامی کام کافی ہوتے ہیں۔طعام وقیام کے امور ہوتے ہیں، اس کے لیے طلبہ کی ڈیوٹیاں لگائی جا سکتی ہیں، ناظم صلوٰۃ کا تقرر کیا جا سکتا ہے۔صفائی کے امور کے جائزہ کے لیے صفائی کا ناظم بنایا جا سکتا ہے۔طلبہ کو وقت پر جگانے، طعام گاہ کی صفائی وغیرہ کا جائزہ لینے، کھانے کی تقسیم کے معاملات، برتنوں کی صفائی وغیرہ کے سارے انتظامات طلبہ کے سپرد کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے ان کی صلاحیتیں بیدار ہوں گی۔

۴۔جسمانی تربیت

جسمانی ورزش اور کھیلوں کا بھی انتظام ہونا چاہیے۔مجھے ڈر ہے کہ مدارس میں اس پر توجہ نہیں دی جاتی جبکہ لیکن سکولوں اور کالجوں میں ایک ادارے کی ٹیم دوسرے ادارے میں جاتی ہے اور وہاں کی ٹیم کے ساتھ کھیلتی ہے۔انعامات دیے جاتے ہیں۔یہ غیر اسلامی نظام نہیں۔کھیل اور ورزش کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اور اس میں مسابقت کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔حضرت عمرؓ نے اپنے والیوں کو لکھا تھا کہ تیر اندازی کا انتظام کرو۔یہ ساری چیزیں تربیت کے مختلف پہلو ہیں اور ان کا اہتمام کیا جانا چاہیے تا کہ ایک متوازن شخصیت وجود میں آئے اور اس کی صلاحیتوں کو نمو ملے۔

تربیت کا لائحہ عمل

ان ساری باتوں کی تربیت میں مدارس کی انتظامیہ کا بھی کردار ہے اور اساتذہ کا بھی، لہٰذا پہلے اساتذہ کی تربیت ہونی چاہیے۔جامعہ نعیمیہ کے مہتمم ڈاکٹر سرفراز نعیمی صاحب کے ساتھ اساتذہ کی تربیت کی بات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ ان سے بھی پہلے مہتممین کی تربیت ہونی چاہیے۔

ان کی نہیں ہوگی تو اساتذہ کی کہاں سے ہونے دیں گے؟ تو استاد، طلبہ کی تربیت کا بہت بڑا آلہ ہے۔ اسے یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ صرف معلم نہیں، مربی بھی ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو طلبہ کی تربیت کا ذمہ دار سمجھے گا تو اسے اپنے کام کی نزاکت کا اندازہ ہوگا۔ اس کا سب سے پہلا کام یہ احساس کرنا ہے کہ طلبہ اسے ماڈل سمجھتے ہیں۔ جیسے استاد کرتا ہے، ویسے ہی طلبہ بھی کرتے ہیں۔ جیسے وہ سوچتا ہے، طلبہ بھی ویسے ہی سوچتے ہیں۔ ہمارے ایک استاد تھے، وہ کلاس میں آ کر سب سے پہلے سگریٹ سلگاتے تھے۔ تو استاد کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ ایک ماڈل ہے۔ خود وہ اپنے آپ کو ماڈل نہ سمجھے، لیکن یہ دیکھے کہ اس کی سیرت و کردار ایسی ہونی چاہیے کہ طلبہ اس کی اتباع کر سکیں۔ تو دینی مدارس میں اساتذہ کی تربیت کا انتظام ہونا چاہیے اور اس میں ان کو دو باتیں سکھائی جائیں۔ ایک تو فنی تربیت کہ مثلاً تختہ سیاہ کو کیسے استعمال کیا جائے، سبق کیسے تیار کیا جائے وغیرہ۔ اور دوسرے نظریاتی تربیت جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ خود اچھا مسلمان کیسے بننا ہے اور دوسرا یہ کہ انہیں اپنے طلبہ کی تربیت کیسے کرنی ہے اور انہیں اچھا مسلمان کیسے بنانا ہے؟ استاد کا کام یہ ہے کہ وہ دین کو طلبہ کے سامنے پرکشش بنا کر پیش کرے تاکہ ان میں اس پر عمل کے لیے آمادگی پیدا ہو۔ دین کو پرکشش بنانے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ استاد خود دین پر عمل کرے۔ دوسرا یہ کہ اس کے اندر اخلاص اور طلبہ کی خیر خواہی کا جذبہ ہو۔ طلبہ یہ محسوس کریں کہ استاد ان کے لیے اخلاص رکھتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ ڈنڈے مار کر آپ کسی کو وہ چیزیں نہیں سکھا سکتے اور نہ اس کے اندر وہ جوہر پیدا کر سکتے ہیں جو محبت اور شفقت کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے مار پیٹ کا سلسلہ بعض مدارس میں، خاص طور پر حفظ کے درجات میں اب بھی جاری ہے۔ یہ ایک غلط طریقہ ہے۔ طلبہ کے ساتھ اپنے تعلق کو شفقت، نرمی اور محبت کی اساس پر استوار کرنا چاہیے تاکہ ان میں پڑھنے کے لیے آمادگی پیدا ہو اور تحکم کے بجائے وہ شراکت کے احساس کے ساتھ سیکھنے کا عمل جاری رکھیں۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمارے ہاں تربیت کے لیے وقت مخصوص نہیں کیا جاتا۔ مجھ سے اگر پوچھیں تو میں کہوں گا کہ چونکہ غایت ہی تربیت ہے، اس لیے کم از کم پچاس فی صد وقت تربیت

کے لیے دینا چاہیے، جس کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں۔ تربیت کے لیے الگ پیریڈ مخصوص کرنے چاہییں اور اگر مثال کے طور پر ۵۰۰ نمبر کے باقی مضامین ہیں تو ان میں کم از کم ۱۰۰ نمبر کا تربیت کا پرچہ شامل کریں۔ اس کو باقاعدہ لازمی پرچہ قرار دیں، یعنی جو تربیت کے پرچے میں فیل ہو، اس کو سارے امتحان میں فیل تصور کیا جائے۔ تربیت میں دیکھا جائے کہ کون طالب علم لڑائی جھگڑا کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، چوری کرتا ہے، وقت پر کلاس میں حاضر نہیں ہوتا وغیرہ۔

اس تربیت کا باقاعدہ نصاب بھی ہونا چاہیے۔ تاہم اگر مدارس کی انتظامیہ توجہ نہ دے تو میں سمجھتا ہوں کہ اساتذہ اپنے طور پر تزکیہ اور تربیت کا نصاب بنا سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں تصوف کی بعض کتابیں شامل نصاب رہی ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس کا اہتمام کیا تھا لیکن بعد میں جب دیوبند کے تعلیمی نظام کی صورت میں اس میں ارتقا ہوا تو بعض تاریخی عوامل کی وجہ سے، جن کے تجزیے میں اس وقت میں نہیں پڑوں گا، تصوف کی کتابیں نصاب میں شامل نہ رہ سکیں۔ میرے خیال میں یہ نصاب میں ایک خامی ہے، اور تربیت اور تزکیے کا مواد نصاب میں لازماً شامل ہونا چاہیے۔ شاہ ولی اللہ، امام غزالی اور دیگر اکابر تصوف کی چیزوں سے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ روایتی تصوف کے لٹریچر میں کچھ کمزوریاں اور خرابیاں بھی موجود ہیں۔ تازہ کاموں میں سے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی چیزیں منتخب کی جا سکتی ہیں اور ایسا مواد چھانٹ کر نکالا جا سکتا ہے جو تصوف کی روایتی کمزوریوں اور بعض غیر اسلامی عناصر سے پاک ہو۔ نصاب کی خامی کو تو ایک اچھا استاد پورا کر سکتا ہے لیکن اچھے استاد کی خامی نہ نصاب پوری کر سکتا ہے اور نہ کوئی اور چیز۔ اس لیے اگر استاد تربیت کو اپنی ذمہ داری محسوس کرے تو وہ سو راستے ایجاد کر لے گا۔

ہر مدرسے میں ایک تربیت کمیٹی بنی چاہیے جس کے سربراہ مہتمم صاحب ہوں یا کسی سینئر استاد کو ناظم بنا دیا جائے اور کچھ صالح طلبہ کو اس کا رکن بنا لیا جائے۔ ہر کلاس کا انچارج استاد تربیتی کمیٹی کا رکن ہو۔ وہ باقاعدہ بیٹھ کر میٹنگیں کریں۔ کچھ پرابلم کیسز ہوتے ہیں۔ بعض طلبا بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی اصلاح کے لیے، ان کے والدین کو بلانے کے لیے ایک کمیٹی بنا لیں اور والدین سے رابطہ رکھیں۔ پھر تربیت کمیٹی اپنے طور پر پورے سال کا ایک پروگرام بنا سکتی ہے مثلاً

آپ ہر ہفتے مختلف اخلاقی خوبیاں پیدا کرنے اور برائیوں سے بچنے کے لیے کسی ایک چیز کو موضوع بنا سکتے ہیں۔ مثلاً اس ہفتے ہمارے پیش نظر غیبت کی مذمت ہے۔ طلبہ کو بتایا جائے کہ غیبت کیا ہے، شریعت نے اس کی کیسے مذمت کی ہے، معاشرے میں اس سے کیا فساد پیدا ہوتا ہے۔ ان باتوں کو ہر کلاس میں تختہ سیاہ پر لکھ دیا جائے۔ طعام گاہ میں لکھ دیا جائے۔ اس طرح مختلف پہلوؤں سے اس چیز کو اجاگر کر کے اس کی قباحت کا احساس زندہ کیا جائے۔ اسی طرح ہر ہفتے کسی نئی چیز پر توجہ مرکوز کی جائے۔

حوصلہ افزائی کے لیے انعام بھی رکھا جا سکتا ہے مثلاً پچھلے ایک ماہ میں جن طلبہ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی، ان کو کوئی انعام دے دیا جائے۔ اس طریقے سے بعض لوگوں نے تجربات کیے ہیں۔ راول پنڈی میں عبدالجبار غازی صاحب نے جو جماعت اسلامی سے الگ ہوئے ہیں، ایک تجربہ کیا۔ انہوں نے گراف بنا کر ہر کلاس میں لٹکا دیے۔ اس پر لڑکوں کے نام لکھے ہوتے تھے۔ جو طالب علم خوبی کے کام زیادہ کرتا، اس کے دو نمبر زیادہ ہو جاتے۔ اس کے برعکس اگر کسی نے گالی دی، تو اس کے دو نمبر کم ہو گئے۔ کسی نے جھگڑا کیا، تو اس کے چار نمبر کم ہو گئے۔ والدین نے کوئی شکایت کی تو دو نمبر اور کم ہو جاتے۔ اس طرح گراف کے ذریعے سے ہر طالب علم کے اخلاق وکردار کا پتہ چلتا رہتا اور طلبہ میں اچھے نمبروں کے لیے مسابقت پیدا ہو جاتی۔

تو یہ تربیت کے مختلف پہلو اور اس کے چند اسالیب ہیں۔ غور اور تجربے سے مزید کئی تدبیریں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ بہر حال طلبہ کو اچھے کاموں کی طرف راغب کرنے اور ان میں برے کاموں سے بچنے کا جذبہ بیدار کرنے کا ایک پورا نظام مدرسے میں ہونا چاہیے۔

جب ہم تربیت کے پہلو سے غور کرنا شروع کریں گے تو کافی کتابیں سامنے آنا شروع ہو جائیں گی، لیکن فوری طور پر دو چیزوں کی طرف میں اشارہ کر سکتا ہوں۔ ایک تو پروفیسر سید سلیم صاحبؒ کا چھوٹا سا مقالہ ''درس گاہ کی ہم نصابی سرگرمیاں'' کے نام سے ہے۔ اور ایک کوشش میں نے بھی کی تھی ''تعلیمی ادارے اور کردار سازی'' کے عنوان سے۔ یہ دونوں کتابیں تعلیمی ادارے میں تربیت سیرت وکردار سے بحث کرتی ہیں۔ اگرچہ ان کا پس منظر دینی مدارس کا نہیں ہے لیکن

مسائل مشترک ہیں، مثلاً بچے کیوں بگڑتے ہیں، ان کی اصلاح کیسے ہونی چاہیے، سیرت وکردار کی خوبیاں کیسے پیدا کرنی چاہییں، اس کے لیے کیا ماڈل سامنے رکھنے چاہییں، کیا کیا گر استعمال کرنے چاہییں وغیرہ۔ میں نے اس کتاب میں اسلامی تربیت کے ۳۱ گر لکھے ہیں۔ ان سے آپ کو کچھ بنیادی مواد مل جائے گا۔

آخر میں، میں دوبارہ عرض کروں گا کہ میری گزارشات محض اخلاص اور دردمندی پر مبنی ہیں۔ میری باتوں سے آپ کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن یہ موضوعات بہرحال اس قابل ضرور ہیں کہ آپ ان کے بارے میں سوچیں۔ دین محض کتابوں میں نہیں لکھا ہوتا۔ یہ معاشرے کی صورت میں ایک زندہ حقیقت ہوتا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے نبی کی امت کو یہ توفیق بخشی کہ اسلامی معاشرہ پچھلی چودہ صدیوں سے بلاانقطاع قائم ہے۔ اس تسلسل کو بقا اور استحکام بخشنے کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ معاشرہ دین سے جڑا رہے۔ یہ کام علما کا ہے لہٰذا ان کے اور معاشرے کے مابین ہم آہنگی ناگزیر ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ علما اس معاشرے کی ذہنی، فکری، جسمانی اور مادی ضرورتوں کو سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو عمل کی توفیق دیں، آمین۔

فکری ومسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو

—— ابوعمار زاہد الراشدی ——
[ڈائریکٹر، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ]

بعد الحمد والصلوۃ۔

کل سے مختلف مسائل پر گفتگو چل رہی ہے۔ ہم نے صبح کی نشست میں نصاب اور اساتذہ کی تدریسی اور تربیتی مشکلات کے حوالے سے بات کی، جس کے نتیجے میں تفصیلی تجاویز سامنے آئی ہیں۔

اس نشست میں میری گفتگو کا عنوان ہے ''فکری ومسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو''۔ فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ جب ایک خاص نصاب کی تعلیم پا کر سوسائٹی میں جاتے ہیں اور انہیں آج کے مسائل اور حالات سے سابقہ پیش آتا ہے تو ان کی فکر اور سوچ کیا ہو؟ ان کا نصب العین اور زندگی کا مقصد کیا ہو؟ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی فکری نصب العین بن جاتا ہے جس کے اردگرد اس کی زندگی کی ساری تگ ودو گھومتی ہے۔ طالب علمی کے دوران میں اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ترجیح قائم ہو جاتی ہے کہ میں نے تو یہ کام کرنا ہے، اور پھر وہ ساری زندگی اسی میں لگا رہتا ہے۔ یہ مرحلہ یعنی کسی طالب علم کی فکری تربیت کے رخ کا تعین، ہم نے اسے آزاد چھوڑا ہوا ہے اور طالب علم اپنی مرضی سے اس کا تعین کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق بھی اس بات سے ہے جو اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے ہماری مشاورت میں زیر غور آئی، یعنی چونکہ ہمارے ہاں

اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظم موجود نہیں، اس لیے ہوتا یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ میں سے جس استاد کے ساتھ طالب علم زیادہ مانوس ہو جاتا ہے، تو جو ذہنی سوچ اس کی ہوتی ہے، وہی طالب علم کی بھی بن جاتی ہے۔ ایک مدرسے میں اساتذہ کے ذہنی رجحانات مختلف ہیں تو دو دو، چار چار طالب علم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح فکری تربیت تو ہوتی ہے لیکن یہ فکر کوئی اجتماعی فکر نہیں ہوتی۔ ہر طالب علم اپنے ذوق کے مطابق کسی استاد کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ذہنی وفکری تربیت ہوتی ہے اور وہ اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ میں اس کو خون کے گروپ سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں خون کے مختلف گروپ کام کر رہے ہیں۔ سپاہ صحابہ کا خون گروپ ہے، جہادی خون گروپ ہے، جمعیت علماے اسلام کا خون گروپ ہے۔ اسی طرح تبلیغی جماعت، اشاعت التوحید والسنۃ اور تحریک خدام اہل سنت کے خون گروپ موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ گروپ آپس میں ملتے ہیں اور کچھ نہیں ملتے۔ اور لطیفے کی بات یہ ہے کہ اتفاق سے میرا خون کا گروپ سب سے مل جاتا ہے۔ میرا خون سب کو لگ جاتا ہے اور سارے خون اس کو لگ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طالب علم کو مجموعی فکر ہم نے کیا دی ہے؟ میں وفاق والوں سے اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کریں تاکہ وہ طلبہ کا کوئی اجتماعی ذہن تو بنائیں اور انہیں کوئی بنیادی سوچ تو دیں۔ یہ تو انہیں بتائیں کہ ملک وملت کے تقاضے کیا ہیں، عالمی صورت حال کے تقاضے کیا ہیں، اور آپ کے مسلک کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ انہیں کوئی اجتماعی سوچ دیں، اس کے ساتھ ساتھ ضمنی ترجیحات کا دائرہ بھی موجود رہے۔

آپ تقریباً اتفاق کریں گے کہ صورت حال ایسی ہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہے کہ اساتذہ، جنہوں نے سوچ دینی ہے اور فکری تربیت کرنی ہے، خود ان کی اپنی اجتماعی فکر کا کوئی اہتمام نہیں۔ عصری تعلیم میں ہر سطح کے استاذ کے لیے اس سطح کا تربیتی کورس کرنا ضروری ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی نظم نہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ فکری طور پر ہم خلفشار کا شکار ہیں۔ ہم پر مغرب کی فکری اور

تہذیبی یلغار ہے۔ اس کی صحیح تعبیر وہ ہے جو ہمارے شیخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کی ہے کہ 'ردۃ و لا ابابکر لھا'۔ یہ فکری ارتداد کا زمانہ ہے۔ آپ ذرا محدود حلقے میں ہیں، اللہ آپ کے ایمان کو سلامت رکھے، لیکن اگر آپ جدید حلقے میں چلے جائیں، کسی کے ذہن کو ٹٹولیں تو احتراماً اور عقیدتاً یا فتوے کے ڈر سے تو وہ شاید کوئی بات نہ کہے لیکن جب آپ اس کی فکر کا تجزیہ کریں گے تو کہیں نہ کہیں ارتداد، ارتیاب اور شک کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہوگا۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ آج کی فکری ارتداد کی لہر سے متاثر ہوگا۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کشمکش کو سرے سے سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، ہمارے گرد حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے اور ہم بالکل ایک دائرے میں محصور ہوتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں نکاح وطلاق یا دوسرے مسائل کے بارے میں شریعت کے احکام کے بارے میں شک ہے۔ اس نے جدید لٹریچر پڑھا ہوا ہے۔ ہم اس کے شک اور اس کی وجہ کو سمجھ کر شک کا کانٹا نکالنے کے بجائے اس کے ساتھ طعنے اور فتوے کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے تو احتراماً خاموش ہو جاتا ہے لیکن اس کا شک پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے، اس لیے یہ جواب نہیں دے سکے اور مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ ہم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کو شک کیا ہوا ہے، اس لیے کہ خود ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے پس منظر میں کون سا فکری الجھاؤ کارفرما ہے۔

بات سمجھانے کے لیے ایک حوالہ دوں گا۔ میں ایک عرصے سے مدارس کے منتظمین سے گزارش کر رہا ہوں کہ آج کا بین الاقوامی قانون جو رائج الوقت ہے، جس کی بنیاد پر ہم پر اعتراضات ہوتے ہیں اور الزام لگایا جاتا ہے، وہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس کی تیس دفعات ہیں۔ ہم نے اس کو تسلیم کر رکھا ہے اور اس پر دستخط کر رکھے ہیں۔ اس وقت عالمی کشمکش میں ایک جھگڑا یہ ہے کہ مغربی اقوام کا موقف یہ ہے کہ جب آپ نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں، اس کے نظام میں شریک ہیں، اس سے فائدے اٹھاتے ہیں، یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے جس کے آپ رکن ہیں، آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ اس میں لکھی ہوئی باتوں کی اپنے

دستور میں پابندی کریں گے، تو آپ اس کے خلاف اقدامات کیوں کر رہے ہیں؟ یہ موقف اس حوالے سے درست ہے کہ جب ہم نے باقاعدہ معاہدہ کر رکھا ہے تو یا تو اس پر عمل کریں اور یا اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے کہ اگر اس چارٹر کو اور اس کی ان تشریحات کو قبول کر لیا جائے جو اقوام متحدہ کے باضابطہ ادارے مثلاً جنیوا انسانی حقوق کنونشن، یونیسکو اور یونیسف وغیرہ کرتے ہیں، تو ہمیں احکام شرعیہ میں سے کم از کم ۸۰ فیصد سے دستبردار ہونا ہوگا۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو یقینی بنایا جائے اور جنس کی بنیاد پر کوئی امتیازی قانون نہ بنایا جائے۔ مرد اور عورت کے مابین تمام معاملات میں مساوات ضروری ہے۔ اب آپ اپنے قوانین کو دیکھ لیں کہ مرد اور عورت کے لیے قوانین میں کہاں کہاں فرق نہیں ہے۔ نماز سے شروع ہو جائیں۔ عائلی قوانین کو دیکھ لیں۔ آپ مرد کو طلاق کا حق دیتے ہیں، عورت کو نہیں دیتے۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ وراثت میں آپ مرد کو حصہ زیادہ دیتے ہیں، عورت کو کم دیتے ہیں۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ شہادت میں آپ بعض معاملات میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کرتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ عورت کو آپ صدر اور وزیر اعظم بننے کا حق نہیں دیتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ اس طرح آپ کی فقہ میں بہت سے ایسے احکام نکلیں گے جہاں آپ امتیاز کے قانون پر عمل کر رہے ہیں جو کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے اور اس پر فوراً کہا جائے گا کہ آپ اس کو منسوخ کریں۔

ایک دوسری مثال لیں۔ عالمی قانون میں آزادی رائے اور تبدیلی مذہب کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ ہر شخص کو کوئی بھی مذہب چھوڑنے یا اختیار کرنے کا اور کسی بھی قسم کی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ لیکن ہم نے توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون نافذ کر رکھا ہے جو رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ ہم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے، ان کو مسجدیں نہیں بنانے دیتے، ان کو اسلامی اصطلاحات استعمال نہیں کرنے دیتے جو مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

یا مثلاً بین الاقوامی قانون میں غلامی کی تمام صورتیں ممنوع ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ غلامی

اسلام کی مطلوبہ چیزوں میں سے نہیں، اس لیے بین الاقوامی معاہدے کے تحت یہ ممنوع سہی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب ممنوع ہے اور آپ مانتے ہیں کہ غلامی درست نہیں تو پھر پڑھاتے کیوں ہیں؟ تعلیمی نصاب سے خارج کیوں نہیں کرتے؟ قرآن پاک سے وہ آیات اور حدیث وفقہ سے وہ ابواب خارج کیوں نہیں کرتے؟

اسی طرح اس میں ایک دفعہ ہے کہ کوئی سزا ایسی نافذ نہیں کی جائے گی جس میں جسمانی تشدد یا ذہنی اذیت ہو یا جس میں توہین وتذلیل ہو۔ یعنی سزا کو تین چیزوں، جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین وتذلیل سے خالی ہونا چاہیے۔ اب آپ کی کون سی سزا اس سے خالی ہے؟ آپ کی ساری حدود میں تشدد ہے، ہاتھ پاؤں کاٹنا، سنگسار کرنا، کوڑے مارنا، کھلے بندوں سزا دینا ہے جس میں توہین اور تذلیل ہے۔ گویا حدود کا نظام لے لیں، خاندانی نظام لے لیں، وراثت کا نظام لے لیں، نکاح وطلاق کا مسئلہ لے لیں، ہمارا کوئی بھی مسئلہ نہیں بچتا جس پر اعتراض نہ ہو۔

تو میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی ان تیس دفعات کو ہمارے ہاں نصاب میں پڑھایا جانا چاہیے، اس حوالے سے کہ آج کا مروجہ بین الاقوامی قانون کیا ہے، ہمارے قوانین کیا ہیں، ٹکراؤ کہاں ہے، ان کا موقف کیا ہے اور ہمارا موقف کیا ہے؟ ہمارے عالم دین کو پتہ تو ہونا چاہیے۔ جب کوئی اعتراض سامنے آئے تو وہ سمجھ تو سکے کہ اعتراض کیوں ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہم نے ان کی کون سی بات قبول کرنی ہے اور کون سی نہیں، لیکن کم از کم ہمارے علما کو اس جھگڑے سے واقف تو ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں سرے سے اس کا کوئی پتہ نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بحث کو اپنے دائرے میں محدود رکھتے ہیں تو اپنے لوگوں کو تو مطمئن کر لیں گے لیکن جب بات جدید تعلیم یافتہ ماحول میں کریں گے تو ہماری بات سنی نہیں جائے گی کیونکہ ہماری بات ادھوری اور بے علمی پر مبنی ہوگی۔

تو فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علما کو یہ پتہ ہو کہ آج کا عالمی ماحول کیا ہے، ہماری کشمکش کس سے ہے، لڑائی کس سے ہے، اس کے مقابلے میں ہم نے کیا تیاری کی ہے؟ اس انداز سے ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں، احادیث کا مطالعہ کریں۔ سارا ذخیرہ موجود ہے۔ قرآن

پاک میں ہر چیز موجود ہے، احادیث کے ذخیرے میں ہر بات کا جواب موجود ہے، البتہ فقہی کتابوں میں اس کی نئی تعبیرات کرنے کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ ہماری اپنی اس انداز سے مطالعہ کرنے کی تربیت نہیں ہے، اس لیے آج کی اس فکری کشمکش میں ہم موثر طور پر حصہ لینے اور کوئی عملی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی پہلے بات اساتذہ کی آئے گی۔ استاد کو پتہ ہوگا تو وہ شاگرد کو بتائے گا۔ اگر اسے خود پتہ نہیں ہوگا تو شاگردوں کو کیا بتائے گا؟ میں نے وفاق والوں سے گزارش کی تھی کہ آج کے مغربی فلسفہ، عالمی کشمکش اور تہذیبی جنگ پر اساتذہ کے لیے بریفنگ کورس کا اہتمام کریں اور نصاب میں بھی ایسی چیزیں شامل کریں، خواہ وہ محاضرات کی شکل میں ہوں یا کسی کتاب کی صورت میں۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر کام نہیں ہو رہا لیکن عرب دنیا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ اس میں سے اچھا مواد مل جائے گا۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ ہے مسلکی تربیت کا۔ ہمارا مسلک کیا ہے اور دیوبندیت کیا ہے؟ یہاں میں تھوڑی سی گستاخی کروں گا جس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میری عادت یہ ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے، کہہ دیا کرتا ہوں۔ اگر ناراض نہ ہوں تو ایک کہاوت عرض کرتا ہوں۔ کہتے کہ چار پانچ نابینا کہیں اکٹھے ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ طے یہ ہوا کہ اس کا فیصلہ 'مشاہدہ' کرنے کے بعد کیا جائے۔ اب وہ گئے اور جا کر ہاتھی کو ٹٹولنے لگے۔ دیکھا تو تھا نہیں، تو کسی کے ہاتھ کان پر آ گئے، کسی کے سونڈ پر اور کسی کے سینگ پر۔ اب وہ تبصرہ کر رہے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ ایک نے کہا کہ ہاتھی لمبا سا ہڈی کا سینگ ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں وہ تو چھاج کی طرح لمبا اور چوڑا سا ہوتا ہے۔ تیسرے نے کہا کہ پانی کا ایک نل ہے جس کو ہاتھی کہتے ہیں۔ چوتھے نے کہا کہ چمڑے کے ایک بڑے سے ستون کو ہاتھی کہا جاتا ہے۔

ہمارا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہم میں سے جس شخص کو جس ماحول میں جس سے واسطہ پڑ جاتا ہے، ہماری دیوبندیت اسی تک محدود ہو جاتی ہے۔ ایک ماحول میں شیعہ سے واسطہ ہے تو دیوبندیت یہی ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ہماری دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ کہیں اہل حدیث سے سابقہ پیش آ جائے تو وہاں دیوبندیت صرف حنفیت کے دفاع میں محصور ہو

جاتی ہے، باقی سارے تقاضے ختم ہو جاتے ہیں۔ کہیں بریلویوں سے لڑائی آ گئی ہے تو دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ میں ان مسائل سے انکار نہیں کر رہا۔ یہ تمام شعبے ہیں۔ مجھے نہ حنفیت کے دفاع کی اہمیت سے انکار ہے، نہ بریلویت کے مقابلے سے اور نہ انکار حدیث اور شیعہ کا جواب دینے سے، لیکن یہ تمام جزوی شعبے ہیں۔ ہم ان الگ الگ شعبوں کی بات تو کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے اہل السنّت والجماعت کا جو اجتماعی دھارا چلا آ رہا ہے، اس کی بات ہم میں سے کوئی نہیں کرتا۔

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا اصل مقصد کیا تھا؟ جب انگریز یہاں آیا تھا اور اس کے ہاتھوں دین مٹ رہا تھا تو کچھ اللہ والوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی کہ دین کو جس حد تک ممکن ہو، بچا لیا جائے۔ مجموعی دین کو، اس کے اجتماعی حصے کو اور سب شعبوں کو بھی۔ میرے نزدیک دیوبندیت تین چیزوں کا نام ہے۔ اگر دیوبندیت میں کسی کو معیار سمجھا جائے تو میرے نزدیک سب سے بڑا معیار شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ تینوں باتیں تھیں: علم بھی بدرجہ اتم، روحانیت بھی بدرجہ اتم، اور جہاد بھی بدرجہ اتم۔ گویا دیوبندیت یہ ہے کہ علم میں بھی کمال ہو، روحانیت میں بھی کمال ہو اور ملی غیرت اور جہاد کے جذبے میں بھی کمال ہو۔

دیوبندی مسلک کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ ہم عقائد کے لحاظ سے اہل سنت ہیں اور فقہی اعتبار سے حنفی ہیں۔ کوئی نیا تشخص ہم نے قائم نہیں کیا۔ ایک مدرسے کے ساتھ ہماری نسبت ہے، جس کے اجتماعی مقاصد کے حوالے سے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے ضمنی طور پر سارے کام کیے۔ حضرت شیخ الہند کو لے لیں۔ کیا انہوں نے حنفیت کا دفاع نہیں کیا؟ ان کے اس پر رسالے موجود ہیں، لیکن اس حد تک جتنی ضرورت پڑی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے 'الشہاب الثاقب' لکھی، لیکن یہ کام ضرورت کی حد تک محدود رہا۔ ان کا اصل مقصد ملی وجود اور ملی مقاصد تھے۔ جہاں ضرورت پڑی، ضمنی اور فروعی مسائل سے بھی تعرض کیا، لیکن اس کے لیے اپنے آپ کو وقف نہیں کر دیا۔ میں بھی یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دیوبندیت سے مراد اگر ہم نے الگ الگ

شعبے لے رکھے ہیں تو میں اس کو دیوبندیت نہیں سمجھتا۔ دیوبندیت نام ہے ملت کے اجتماعی دینی کام کا۔ جہاں کسی ضمنی کام کی ضرورت پڑتی ہے، وہاں وہ ضرور کیا جائے لیکن ہمارا اجتماعی اور مین دھارا یہ ہے کہ اس ملک میں، اس معاشرے میں دین کی اجتماعی حفاظت کی جائے اور نئی نسل تک دین صحیح حالت میں منتقل ہو۔ اجتماعی مقاصد اور ملی مقاصد کے حوالے سے ہم طلبہ کی تربیت کریں۔

ہمیں اس پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ فکری تربیت، ملکی مقاصد اور مسلک کے اصل اہداف کے حوالے سے ہمیں تھوڑا سا ماضی کی طرف پلٹ کر اپنے بزرگوں کو دیکھیں اور اس کے مطابق علمی کمال، روحانیت اور ملی غیرت وحمیت کی خصوصیات اپنے طلبہ میں پیدا کر کے اجتماعی مقاصد اور ضروریات کے لیے ان کو تیار کریں۔

باتیں تو میں اور بھی بہت سی کہنا چاہتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ان پر تفصیل سے بات ہوگی۔ اس وقت میں چاہوں گا کہ مولانا محمد بشیر صاحب سیالکوٹی آپ حضرات کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے جدید اسلوب اور اس کی اہمیت کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دینی مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا منہج

ـــــ مولانا محمد بشیر سیالکوٹی ـــــ
[رئیس معہد اللغۃ العربیہ، اسلام آباد]

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

معزز حاضرین!

مجھ سے قبل میرے بزرگ دوست مولانا زاہد الراشدی ہمارے فکری اور مسلکی رویوں کے حوالے سے نہایت اہم گفتگو فرما رہے تھے۔ مولانا کی گفتگو مجھے بھی جرات سخن عطا کرتی ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی گفتگو میں بعض باتیں ایسی فرمائی ہیں جو عام طور پر لوگ نہیں کہتے۔

۱۹۶۵ء میں، میں کراچی میں حاضر ہوا تو حضرت مولانا یوسف بنوری صاحبؒ کے ہاں ٹھہرا۔ ہفتہ عشرہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے ہاں بھی گزارا۔ مفتی صاحبؒ نے اپنی وہ معروف تقریر جو اب ''وحدت امت'' کے نام سے چھپی ہوئی ہے، ہمارے ہی ادارے ''جامعہ تعلیمات اسلامیہ'' (فیصل آباد) میں فرمائی تھی۔ مولانا عبدالرحیم اشرفؒ اس کے سرپرست تھے اور میں اس ادارے کا ناظم تھا۔ اس تقریر میں انہوں نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک دن بڑے غمگین بیٹھے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ حضرت کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ ہم نے ساری زندگی اس بات میں لگا دی کہ حنفی مسلک کی ترجیح اور فضیلت دوسرے مسالک کے مقابلے میں ثابت کر دیں، جبکہ ہماری اصل ذمہ داری تو اسلام کی اساسی تعلیمات کو پیش کرنا تھا۔

اس رویے کا ایک پہلو تو یہی ہے جس کی طرف شاہ صاحبؒ نے اشارہ فرمایا، یعنی مسلک کی

تائیدواشاعت کو ہی زندگی کا مقصد بنالینا، حالانکہ مسلک ایک بہت محدود دائرہ ہے اور اصل چیز دین کی خدمت ہے۔ اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے ہاں مسلک زدگی کا مرض اس حد تک پایا جاتا ہے کہ ذہین اور باصلاحیت اہل قلم جو کچھ لکھتے ہیں، ان کی علمی کاوشوں کی قدر و قیمت بھی مسلک کی بنیاد پر متعین کی جاتی ہے۔ ہمارے استاد محترم مولانا عبد الغفار حسن صاحب مدظلہ ایک نہایت فاضل علمی شخصیت ہیں اور مدینہ یونیورسٹی میں اٹھارہ سال تک علم الاسناد کے پروفیسر رہے ہیں۔ مسلکاً اہل حدیث ہیں لیکن مخصوص مسلکی مزاج نہ رکھنے کی وجہ سے ان کے اہل حدیث ہونے پر خود اہل حدیث حضرات میں کئی لطیفے بنے ہوئے ہیں۔ میں خود اہل حدیث مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن اس طرح کہ اس حوالے سے اپنا تعارف پسند نہیں کرتا، ہاں اگر کوئی مجھے اہل حدیث کہے تو اس سے براءت بھی نہیں کرتا۔ لیکن اہل حدیث میں پانچ چھ گروہ ہیں اور عربی زبان کے حوالے سے میری جو ٹوٹی پھوٹی خدمات ہیں، ان سے عمومی استفادہ میں بھی یہی چیز حائل ہے کہ میں کس حلقے کے زیادہ قریب ہوں اور کس سے دور۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا شکوہ بھی سناتا جاؤں۔ وہ فرماتے تھے کہ میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا رکن ہوں لیکن میری کتابوں کی پذیرائی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہلے ہوئی ہے اور ان درویشوں کے ہاں بعد میں۔ ان کی زندگی میں تو برصغیر کے مدارس میں بہت ہی کم ہوئی۔ یہ مرض ہمارے اس خطے میں، واقعہ یہ ہے کہ بہت زیادہ ہے۔

خیر یہ تو میرے کچھ جذبات تھے جن کا مولانا راشدی کی گفتگو کے حوالے سے اظہار ہو گیا۔ جہاں تک میرے موضوع کا تعلق ہے تو عربی زبان کے ایک خادم اور اس کی تعلیم وتدریس سے متعلق ہونے کے ناتے سے میں اپنی زندگی کے بعض تجربات سے آپ حضرات کو آگاہ کرنا چاہوں گا۔

میرے خاندان میں کوئی پرائمری پاس نہیں تھا۔ گاؤں میں پہلا سکول بنا تھا۔ جب سکھ وہاں سے گئے تو میری عمر گیارہ سال تھی۔ والد صاحب کبھی پرائمری کرنے کے لیے سکول میں داخل ہونے کو کہتے تھے، اور کبھی کہتے تھے کہ پرائمری کی کیا ضرورت ہے، تم زراعت کیا کرو۔ میں جب

پہلی جماعت میں تھا تو ہمارے گاؤں میں ایک موحد عالم آئے۔ وہ شروع شروع میں چھوٹی موٹی بدعات کر لیا کرتے تھے تا کہ لوگ انہیں وہابی نہ سمجھیں، مثلاً ختم پڑھ لیتے تھے، لیکن ہمارے دل میں یہ بات انہوں نے ڈال دی کہ یہ شرک ہے۔ انہوں نے مجھے تین سال میں گلستان، بوستان اور پند نامہ وغیرہ کتابیں پڑھا دیں۔ بس یہ ایک تعلیمی پس منظر ذہن میں آتا ہے، ورنہ مجھ سے پہلے میرے خاندان میں کوئی شخص پڑھا لکھا نہیں تھا۔

اس کے بعد آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے جب مجھے دینی مدارس میں پڑھنے کا موقع ملا تو صورت حال یہ تھی کہ مجھے پڑھانے والے اساتذہ پٹھان تھے، میں خود پنجابی تھا، کتاب فارسی میں تھی اور جس زبان کو سیکھنا مقصود تھا، وہ عربی تھی۔ اس صورت حال میں غالباً آج بھی کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ میں نے دو سال اس نظام میں پڑھا اور میرا شمار انعام پانے والے طلبہ میں ہوتا تھا۔ میں نے 'زرادی' وغیرہ کتابیں پڑھ لی تھیں اور صرف ونحو کے قواعد اچھی طرح سے رٹے ہوئے تھے۔

یہ غالباً ۵۷ء یا ۵۸ء کی بات ہے کہ کتابوں کے ایک تاجر نے بیروت سے تفسیر ابن کثیر وغیرہ کچھ عربی کی کتابیں منگوائیں جن کی پیکنگ کے لیے عربی کے پرانے اخبارات استعمال کیے گئے تھے۔ آپ یقین جانیے، ان اخبارات کو دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ یہ جس زبان کی گردانیں ہم یاد کرتے اور جس کے قواعد کو ہم رٹا لگاتے ہیں، یہ دنیا کے کسی علاقے میں لکھی پڑھی بھی جاتی ہے اور اس میں اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ یعنی بات 'ضرب زید عمرا' سے آگے بھی ہے۔

اسی طالب علمی کے دور میں جب میں 'ابواب الصرف' پڑھتا تھا تو مجھے یاد ہے کہ ایک دن استاد نے لم یضرب کے صیغے پر ہلکی سی چھڑی ماردی۔ یہ پہلی اور آخری چھڑی تھی، لیکن میں نے اس وقت یہ سوچا کہ بڑا ہو کر اس کتاب کا کچھ نہ کچھ علاج ضرور کروں گا۔ اب اتنے عرصے کے بعد جب میں 'ابواب الصرف' کو بطرز جدید مرتب کر رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اس وقت کی سوچی ہوئی بات کیسے حقیقت کا روپ دھار رہی ہے۔

عربی نصاب اور طرز تدریس کی اصلاح کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے جو ابتدائی خیال ذہن میں ڈالا تھا، وہ بعد میں انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے سے اور پختہ ہوا کہ اس پہلو میں عربی مدارس کی مدد کرنی ہے، کیونکہ عربی زبان دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح محض ایک زبان نہیں ہے۔ یہ ہمارے دین کا حصہ ہے۔

اس کے بعد مجھے عرب ممالک میں رہنے اور کام کرنے اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور دوسرے عالمی سطح کے اہل علم اور مفکرین سے ملنے کا موقع ملا۔ مولانا ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان میں ایک سپاہی تو ایسا ہونا چاہیے جو قرآن کی زبان کو صحیح انداز میں پیش کرنے کے لیے کام کرے۔ اس عرصے میں، میں مختلف نوکریاں بھی کرتا رہا۔ وزارت خارجہ میں کام کا موقع ملا، اقوام متحدہ سے بھی آفر ہوئی۔ اور میں کئی دفعہ بزنس اور نوکریوں کو چھوڑ کر واپس آیا کہ مجھے یہ کام کرنا ہے۔ میں اس لیے نہیں پیدا ہوا کہ کوئی کوٹھی بنا کر مر جاؤں۔

مجھے عربوں میں سرکاری سطح پر کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے حکومت پاکستان بلکہ مملکت پاکستان کے بے شمار خسارے خود ٹیبل پر بیٹھ کر دیکھے ہیں جو عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ بیس کے قریب عرب ملک ہیں جن کے ساتھ ہمیں سرکاری سطح پر ڈیلنگ کرنی ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض نہایت خفیہ تجارتی اور سیاسی ڈیلنگز بھی ہوتی ہیں، لیکن ہمارے ملک میں وزارت خارجہ کی سطح پر صرف ایک مترجم ہوتا ہے جو بوقت ضرورت صدر ہاؤس اور وزیر اعظم ہاؤس میں بھی خدمات انجام دیتا ہے۔

میں ایک واقعہ آپ کو سنانا چاہوں گا جس کا میں عینی شاہد ہوں۔ ۱۹۷۹ء میں بیت اللہ پر جب کچھ جذباتی نوجوانوں نے قبضہ کیا تو میری ڈیوٹی اس وقت پاکستانی وزارت خارجہ میں تھی۔ اتفاق سے اس واقعہ کی اطلاع جب دفتر میں موصول ہوئی تو میں میز پر موجود نہیں تھا۔ میرے ایک ساتھی مترجم نے، جو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے، اس کی فوری رپورٹ تیار کر کے حکومت پاکستان کو بھجوا دی، لیکن عربی سے مناسب واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک ایسی بھیانک غلطی ان سے سرزد ہوئی کہ اس کا بہت بھاری نقصان حکومت پاکستان کو اٹھانا پڑا۔ ہوا یوں کہ سعودی حکومت

کی طرف سے فراہم کردہ عربی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ 'بعض الخارجین علی النظام' یعنی حکومت کے کچھ باغیوں نے بیت اللہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ عربی زبان میں خرج کے ساتھ جب علی کا صلہ آئے تو اس کا مطلب بغاوت کرنا ہوتا ہے، لیکن میرے ساتھی مترجم اس سے واقف نہیں تھے، چنانچہ انہوں نے ترجمہ یوں کر دیا کہ Some non-Muslims have captured the Kaba. یعنی کچھ غیر مسلموں نے بیت اللہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ میں جب اگلے دن دفتر میں گیا اور رپورٹ کی کاپی دیکھی تو میں نے سر پکڑ لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ آپ نے کیا کر دیا؟ کم از کم ترجمہ چیک تو کرا لیتے۔ میں نے کہا کہ فوراً پاکستان کا ریڈیو آن کرو۔ سعودیہ کے وقت کے مطابق آٹھ بجے جبکہ پاکستان کے وقت کے مطابق دس بجے کی خبریں نشر ہو رہی تھیں اور ان میں بتایا جا رہا تھا کہ یہاں علمائے کرام امریکی سفارت خانے کو جلا چکے ہیں۔ ظاہر ہے، اگر یہ خبر نشر ہوگی کہ کعبہ پر کافروں نے قبضہ کر لیا ہے تو ردعمل یہی ہوگا۔ بعد میں حکومت پاکستان کو کروڑوں روپے خرچ کر کے ایمبیسی کی مرمت کرانا پڑی کیونکہ بین الاقوامی ضابطوں کے مطابق ہماری حکومت اس کی حفاظت کی ذمہ دار تھی۔

اب میں مختصراً یہ بات واضح کرنے کی کوشش کروں گا کہ عربی زبان کی تدریس کے حوالے سے دینی مدارس میں مروج طریقے میں کیا نقص پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس طریقے کی بنیادی خامیاں دو ہیں:

ایک، زبان کے عملی استعمال کے بغیر صرف ونحو کے قواعد رٹانا۔

اور دوسرا، لسانی مسائل کی تعلیم میں مناسب ترتیب اور تقسیم کا فقدان۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی کی تعلیم کے لیے 'ابواب الصرف' کی طرز پر گردانوں کا رٹانا عربی مدارس اور دینی علوم کے لیے بدنامی کا باعث ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ گردانیں نہیں ہونی چاہییں، لیکن جس طرح سے صرف کا یہ پیچیدہ فن، زبان کے عملی استعمال کے بغیر پڑھایا جاتا ہے، وہ ایک نقصان دہ بات ہے۔ دنیا کے عجائبات میں اگر اس کا شمار کریں تو غلط نہیں ہوگا۔ آپ اندازہ کیجیے کہ مثلاً 'ارشاد الصرف' یا 'ابواب الصرف' وغیرہ پڑھنے والا طالب علم تقریباً ۵۳ ہزار الفاظ پڑھتا

اور یاد کرتا ہے، اور صرفی قواعد کا اتنا ماہر ہوتا ہے کہ آپ اسے پنجابی کا کوئی لفظ دیں تو وہ عربی کی طرز پر اس کی گردان بنا دے گا۔ میں خود اس طریقے سے گزرا ہوں۔ اور یہ جو مدارس میں جملہ مشہور ہے کہ ''دعا یدعو پڑھدے نٹھے تے ہل ویندے ڈٹھے'' تو حقیقت یہ ہے کہ ہم خود انہیں بھگاتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے کہ صرف ونحو بلکہ تمام علوم میں مناسب ترتیب اور ان کے مواد میں تقدیم وتاخیر ہونی چاہیے۔ موجودہ نصاب میں، مثال کے طور پر، نحو کی سب سے پہلی کتاب 'علم النحو' میں وہ بیشتر مسائل اور مثالیں جو طالب علم اگلے مرحلے کی کتابوں 'ہدایۃ النحو' اور 'شرح جامی' وغیرہ میں پڑھتا ہے، درج کر دی گئی ہیں۔ مثلاً جملہ انشائیہ کی ساری قسمیں اسی سطح پر طالب علم کے سامنے رکھ دی گئی ہیں، جبکہ سردست صرف جملہ انشائیہ اور جملہ خبریہ کا فرق سمجھا دینا کافی ہے۔ اسی طرح مستثنیٰ منہ کی مختلف اقسام، جن میں سے بعض کافی پیچیدہ ہیں، ایک مبتدی طالب علم کو ان میں الجھانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح باقی مباحث میں بھی موٹی موٹی اور بنیادی چیزیں سکھانے کی ضرورت ہے، باقی تفصیلات اگلے درجات پر چھوڑ دی جائیں۔ ہمارے ہاں 'شرح مائۃ عامل' کو جس طرح سے پڑھایا جاتا ہے، وہ معلوم ہی ہے۔

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایک واقعہ ہوا کہ مصر سے نحو کے ایک بلند پایہ استاد تشریف لائے اور انہوں نے اس موضوع پر پاکستانی طلبہ کو ایک لیکچر دیا۔ اس میں انہوں نے کہا کہ عبد القاہر جرجانی نے فلسفہ نحو پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام 'العوامل المائۃ' ہے، اس پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ حاضرین نے انہیں بتایا کہ یہ کتاب تو یہاں بلکہ ترکی سے انڈونیشیا تک ہر جگہ داخل نصاب ہے اور عربی کے ابتدائی طلبہ کو پڑھائی جاتی ہے۔ وہ حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ رسالہ تو فلسفہ نحو میں لکھا گیا ہے نہ کہ نحو میں اور اس کا مطالعہ ایک منتہی کو کرنا چاہیے نہ کہ ایک مبتدی طالب علم کو۔

اگر آپ کسی بچے سے یہ کہیں کہ چونکہ تم نے ABC یاد کر لی ہے، اس لیے اب ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ کے قواعد بھی رٹ لو تو یہ کتنی غلط بات ہوگی۔ ان کا مرحلہ تو بہت بعد میں آئے گا۔ لیکن

سچی بات یہ ہے کہ ہم اپنے طلبہ کے ساتھ اس سے بھی زیادہ غیر معقول رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ایک طالب علم بیچارہ گاؤں کے ماحول سے اٹھ کر آتا ہے اور اس کو 'اسناد' کی نظری بحثوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے کہ ایک 'مسند' ہوتا ہے اور ایک 'مسند الیہ'، اسم 'مسند الیہ' بھی ہوسکتا ہے اور 'مسند' بھی، فعل صرف 'مسند' ہوسکتا ہے، 'مسند الیہ' نہیں ہوسکتا، جبکہ حرف نہ 'مسند' ہوتا ہے اور نہ 'مسند الیہ'۔ اب واقعہ یہ ہے کہ ان نظری بحثوں اور تدقیقات کو سمجھنے کے لیے طالب علم کا ذہن اس مرحلے پر تیار نہیں ہوتا اور نتیجتاً وہ اس فن سے متوحش ہو جاتا ہے۔

یہ باتیں تو صرف ونحو کی تعلیم کے حوالے سے تھیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ عربی کی 'لغت' بھی سکھائی جانی چاہیے، جو کہ مدارس میں نہیں پڑھائی جاتی۔ ہم ہر چیز عربی میں پڑھاتے ہیں لیکن عربی نہیں پڑھاتے۔ زبان کے استعمال میں بعض نازک چیزیں ایسی ہیں جن پر خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً مختلف افعال کے درست مصادر کا استعمال، مصادر کے بدلنے سے معانی کے بدلنے کا علم، فعل کے مفہوم میں صلات کے بدلنے سے پیدا ہونے والی تبدیلی، اور اس طرح کے بعض دوسرے امور۔ ان چیزوں کو توجہ سے سیکھے بغیر درست عربی نہ بولی جا سکتی ہے اور نہ لکھی، بلکہ ترجمہ بھی درست نہیں کیا جا سکتا۔ آرمی میں ایک خطیب صاحب نے تقریر کرتے ہوئے 'الشیطان یعدکم الفقر' کا ترجمہ یہ کیا کہ ''شیطان تم سے فقر کا وعدہ کرتا ہے''۔ میں نے گزارش کی کہ یہاں یعد کا معنی وعدہ کرنا نہیں بلکہ ڈرانا ہے۔ اگر وعد کا مصدر وعد ہو تو معنی وعدہ کرنا ہوتا ہے، لیکن وعید ہو تو معنی ڈرانا اور دھمکانا ہوتا ہے۔ واللہ یعدکم مغفرۃ میں پہلا جبکہ الشیطان یعدکم الفقر میں دوسرا معنی مراد ہے۔ تو کہنے لگے کہ مدارس میں ہم نے یہ چیزیں نہیں سیکھیں۔ اسی طرح گزشتہ حاضری کے موقع پر میں نے یہاں تفنن کے لیے اساتذہ اور طلبہ سے بعض افعال کے مصادر پوچھے تو غلط جواب ملا۔ مثلاً فرح یفرح کا مصدر فرحا اور نظر ینظر کا نظرا بتایا گیا، حالانکہ صحیح مصادر فرَحاً اور نظَراً ہیں۔

اگر کسی کو تجوید کی سات کتابیں از بر ہوں تو آپ اسے قاری نہیں مانتے، بلکہ قاریوں کا محض نقاد مانتے ہیں جو خود تو ایک سورت بھی تجوید کے قواعد کے مطابق نہ پڑھ سکے لیکن نکتہ چینی ہر قاری

پر کر سکے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ عربی مدارس کے لوگوں کو صرف ونحو آتی ہے، یہ صحیح بات نہیں ہے۔ یہاں تو یہ ہو رہا ہے کہ سات آٹھ سال کے نصاب میں وہی باتیں بار بار طوطے کی طرح طلبہ کو رٹا دی جاتی ہیں اور وہ بھی بغیر استعمال کے، اور اسے آتا کچھ بھی نہیں۔ آپ کسی کو زبانی کتنا ہی لیکچر دے ڈالیں کہ ڈرائیونگ کرتے وقت گاڑی کو یوں سنبھالنا ہے، بریک یوں لگانی ہے وغیرہ، لیکن جب تک آپ اس کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھائیں گے نہیں، اسے ڈرائیونگ نہیں آئے گی۔ تمام ٹیکنیکل فنون کا یہی معاملہ ہے کہ انہیں عملی طور پر سکھانا پڑتا ہے۔ زبان بھی ایک عملی، اور استعمال کی چیز ہے۔ اس کی تعلیم میں بھی اس اصول کی پابندی کی جانی چاہیے۔ صرف ونحو کا مقصد تو آپ یہ بتاتے ہیں کہ 'صیانة الذهن عن الخطا اللفظی' یعنی لکھنے اور بولنے میں خطا سے بچ جانا، لیکن جب لکھنا بولنا ہی نہیں تو غلطی کہاں سے ہوگی؟

اس طریقے کے دفاع میں عام طور پر کئی باتیں کہی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اکابر نے بنایا ہے اور اسی کے مطابق تعلیم پا کر بڑے بڑے اہل علم تیار ہوئے ہیں۔ ہمیں اکابر کا پورا احترام ملحوظ ہے لیکن بات یہ ہے کہ ہمارے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے اگر کہیں ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت ہے تو اس سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ کہتے ہیں کہ آپ کو صرف عربی زبان کی فکر ہے، آپ اسی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ کا ستر فی صد نصاب عربی میں ہے، تو عربی کی استعداد سے کیسے صرف نظر کیا جا سکتا ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد عربی بطور زبان سکھانا نہیں بلکہ علوم شرعیہ اور مسائل کی تعلیم دینا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک غلط طرز فکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بسا اوقات علما ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ عربی کی تعلیم کے مخالف ہوں۔ ہمارے اختیار کردہ طریقے سے جو قباحتیں سامنے آ رہی ہیں، میں ان میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

ایک تو یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دینی مدارس کے اہل علم صحیح عربی میں چند جملے بھی لکھ اور بول نہ سکیں۔ اس سے زبان بدنام ہوتی ہے۔ جب سالہا سال تک اعلیٰ عربی نصاب پڑھانے والا شیخ

الحدیث عربی میں گفتگو نہ کر سکتا ہو تو ایک عام ڈاکٹر اور پروفیسر تو لازماً متوحش ہوگا کہ یہ تو ایسی مشکل زبان ہے کہ بڑے بڑے علما کو بھی زندگی بھر پڑھنے پڑھانے کے باوجود بولنی نہیں آتی۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ میں نے اس بات کا بڑا وسیع تجربہ کیا ہے کہ ہمارا طریقہ عربی کی بدنامی اور بالواسطہ انگریزی کے غیر ضروری تسلط اور فروغ کا سبب بن رہا ہے۔

آپ کے شہر گوجرانوالہ میں ہم نے چند ماہ قبل طالبات اور معلمات کے لیے عربی ریفریشر کورس کا اہتمام کیا۔ ایک ایم اے پاس معلّمہ نے کہا کہ پہلی مرتبہ سنا ہے کہ عربی میں بھی ریفریشر کورس ہوتے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ عربی ایک مردہ زبان ہے، ہمارے دین کی مقدس زبان ہے، کہیں لکھی بولی نہیں جاتی، تو اس میں ریفریشر کورس کرانے کا کیا مطلب، کیونکہ ریفریشر کورس تو نئی جان ڈالنے یا تازگی پیدا کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ تصور ہمارے صرف ونحو کے طریقے سے عربی پڑھانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ عام طلبہ تو کیا، خود دینی مدارس کے اساتذہ بھی اسی تصور میں مبتلا ہیں۔ میرے پاس علما عربی میں خط لکھوانے کے لیے آتے ہیں، یا کہیں عربی میں تقریر کرنی ہو تو مجھ سے کہا جاتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے ایک بڑے عالم سے کہا کہ مولانا، آپ شیخ الحدیث والتفسیر ہیں، آپس میں بیٹھے ہیں، بے تکلفی سے بتایئے کہ آپ عربی کو مشکل سمجھتے ہیں یا آسان؟ کہنے لگے، خدا کی قسم مشکل ہے، ساری عمر پڑھی پڑھائی ہے لیکن عربوں کے پاس جاتا ہوں تو بول نہیں سکتا۔ میں نے ان سے کہا، خدا کی قسم یہ بالکل مشکل نہیں ہے۔ آپ کو مشکل اس لیے لگتی ہے کہ آپ دوڑ تو پنڈی کی طرف رہے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ لاہور نہیں آ رہا۔ اس طرح اگر آپ تیز دوڑیں گے تو لاہور قریب نہیں آئے گا بلکہ اور دور ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اردو دان لوگوں کے لیے انگریزی کی نسبت عربی سیکھنا زیادہ آسان ہے۔ دونوں زبانوں کے حروف تہجی اور ان کا تلفظ ایک جیسا ہے اور عربی زبان کے الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ ہم خود اپنی زبان میں روزمرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح ہم انگریزی کی بہ نسبت عربی سے زیادہ مانوس ہیں۔

اسلامی تہذیب وتمدن کو مٹانے کے لیے جو بھی منصوبے استعماری طاقتوں نے تیار کیے،

عربی زبان کو دبانے اور ختم کرنے کی کوششیں ان کا لازمی حصہ تھیں۔ وہ اسلام دشمنی کی بنا پر ایسا کرتے ہیں اور ہم وہی کام اپنی سادہ لوحی اور قدیم طرز تعلیم پر جمود کے ذریعے سے کر رہے ہیں۔

پھر آپ یہ دیکھیں کہ برصغیر کے علما کی تصنیفات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے جو اردو اور فارسی زبانوں میں ہے اور اس وجہ سے عالم عرب ان سے استفادہ کرنے سے محروم ہے۔ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب ازالۃ الخفاء، جس کے بارے میں نواب صدیق حسن خانؒ نے لکھا ہے کہ لم یولف مثلہ قبلہ و لا بعدہ، لیکن عرب لوگ اس سے واقف نہیں۔ ہم کچھ دوست فیصل آباد میں مولانا اسحاق چیمہ صاحب کے گھر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے تو میں نے عرض کیا کہ مولانا، ہماری جان تو فاتحہ خلف الامام کی بحث سے نہیں چھوٹتی، جبکہ اس کے علاوہ بھی کئی کام ہیں۔ مثال کے طور پر ازالۃ الخفاء کو عالمی سطح پر علمی حلقوں کے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہیں اس کتاب کی تعریب کی ابتدائی تحریک ہوئی۔ میں نے مولانا ارشاد الحق اثری صاحب سے گزارش کی کہ وہ اس کی تخریج کر دیں اور خود میں نے اس کی تعریب کرنا شروع کر دی۔ ایک بڑے حصے کا عربی ترجمہ میں نے خود کیا ہے اور باقی ماندہ ایک عرب مترجم سے کروا رہا ہوں۔ یہ کام دو تہائی کے قریب مکمل ہو گیا ہے۔ اگر مولانا یوسف بنوریؒ حیات ہوتے تو ان سے گزارش کرتا کہ اس کا مقدمہ تحریر فرمائیں، لیکن یہ بھی مجھے خود ہی لکھنا پڑا اور اب وہ ”الشاہ ولی اللہ، حیاتہ و دعوتہ“ کے نام سے الگ کتاب کی صورت میں بیروت سے چھپ گیا ہے۔ اسی طرح شرعی عدالت نے قادیانی مسئلے پر جو فیصلہ کیا تھا، اس کا بھی میں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں ترجمہ کیا۔ تو اس نوعیت کے علمی کاموں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جو فصیح عربی میں ترجمہ کی صلاحیت رکھنے والے مستعد اور قابل نوجوانوں کی ایک بڑی کھیپ کا منتظر ہے۔

مسئلے کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ علما یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ حکومت ان کے سپرد کر دی جائے اور وہ اس کے معاملات کو چلانے کے اہل ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے عملی میدانوں میں کام کرنے کے لیے علما کی مناسب تیاری نہیں ہے جس کی وجہ سے سیکولر ذہن کے لوگوں کو ان میدانوں میں آگے بڑھنے اور سیکولر نظریات اور اقدار کو فروغ دینے کے مواقع ملتے

ہیں۔ اسلام آباد میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز (NUML) میں سیکولر مزاج کے حامل عربی کے ماہرین تیار کیے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ مدارس پر پھبتیاں کستے ہیں کہ ان لوگوں کو عربی نہیں آتی۔ وہاں مخلوط تعلیم کا ماحول ہے اور آزاد ماحول میں تربیت پانے والے فوجی افسران اس کے نگران ہیں۔ اگر کوئی دینی مزاج رکھنے والا استاذ اس کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو کرنل صاحب ڈانٹ پلا دیتے ہیں۔ گویا عربی زبان کے میدان میں خدمات انجام دینے کے لیے بھی ماہرین سیکولر بنیادوں پر تیار ہو رہے ہیں، اور یہ اس لیے کہ مذہبی طبقات کے نوجوان اس کام کے لیے آگے نہیں بڑھے۔

میں اپنی ان گزارشات کا حاصل چند نکات کی صورت میں پیش کرنا چاہوں گا:

۱۔ آپ عربی زبان کو سہل اور دلچسپ بنا کر پیش کریں، اس کے مشکل ہونے کے تاثر کو ختم کریں اور صرف ونحو کے قواعد سے بقدر ضرورت مدد لیتے ہوئے اصل توجہ زبان کے عملی استعمال پر مرکوز کریں۔ اس ضمن میں اب کافی ذخیرہ سامنے آ چکا ہے، آپ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ عرب دنیا میں رائج کتابوں میں سے ایک کتاب التحفة السنية فی شرح الآجرومية ہے، جو میں نے اہل حدیث مدارس میں لگوائی تھی اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کہتے ہیں کہ مصر میں یہ کتاب ہر بچے کو ازبر ہوتی ہے۔ اصل ''رسالہ آجرومیہ'' مراکش کے علاقے آجروم کے رہنے والے کسی قدیم بزرگ کا ہے اور اس کی شرح محی الدین عبدالحمید نے لکھی ہے۔ یمنیوں نے اسے مزید اتنا آسان بنا دیا ہے کہ اسے ہمارے یہاں سکول کی پہلی جماعت میں پڑھایا جا سکتا ہے۔

۲۔ ابواب الصرف کے بارے میں میری اصل رائے تو یہ ہے کہ اس طریقے سے 'صرف' نہ پڑھائی جائے، لیکن مانے گا کون۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس میں استعمالات اور مشقوں کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ کچھ تو صورت حال بہتر ہو سکے۔ مثلاً صـــــرف کے بجائے، جو نسبتاً قلیل الاستعمال ہے، عـــلم کی گردان پڑھائی جائے۔ اور خالی صیغے اور گردانیں رٹانے کے بجائے ان کے استعمال کے لیے جملے دیے جائیں۔ مثلاً من علمك القراءة، من علمك الحديث،

ممن تعلمت الحديث الشريف، تعلمت من فلان ـ اس طرح طالب علم گردان کے ساتھ ساتھ استعمال بھی سیکھ جائے گا۔ اسی کے ضمن میں آپ مدرسے کے ماحول سے متعلق کئی دوسرے جملوں کی مشق بھی کرواسکتے ہیں۔ مثلاً في مدرستنا عشرة مدرسين۔ الشيخ محمود يعلمنا القران۔ والشيخ حامد يعلمنا الفقه الاسلامي۔ من يعلمك اللغة العربية؟ الاستاذ ابراهيم يعلمنا اللغة العربية۔ وغیرہ

اسی طرح باقی کتابوں میں سے بھی کوئی کتاب عملی استعمال کے بغیر نہ پڑھائی جائے۔ فوری طور پر وہ کتابیں نصاب میں لگانی چاہییں جن میں قواعد کے استعمال کی مشقیں شامل کی گئی ہیں، کیونکہ مشق اور اجرا سے ہی قاعدہ صحیح طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ طلبہ کو 'قصص النبيين' پڑھائیں لیکن مشقوں کے ساتھ۔ اس کی ورک بک بھی ساتھ پڑھائیں۔ اس طریقے سے طالب علم جب پڑھے ہوئے ذخیرے کو استعمال کرے گا تو اسے ساله شيئا اور ساله عن شئ جیسے محاورات کا فرق عملی طور پر سمجھ میں آئے گا اور وہ غلطی نہیں کرے گا۔ اسلامی یونیورسٹی میں محاوروں کے غلط استعمال پر اکثر مذاق ہوتا رہتا ہے۔ طالب علم کہتا ہے، سالت من المدرس یاسالت من المدير۔ حالانکہ صحیح محاورہ یا تو ساله شيئا ہے (یعنی کسی سے کوئی چیز مانگنا) اور یا ساله عن شئ (یعنی کسی چیز کے بارے میں پوچھنا)۔ سال کے ساتھ من صلے کے طور پر استعمال نہیں ہوتا۔ اسی طرح مثال کے طور پر ارحم علىٰ حالنا غلط ہے۔ صحیح محاورہ اللهم ارحمنا ہے۔ رحم کے ساتھ علىٰ استعمال نہیں ہوتا۔ ہر زبان میں صلات (Prepositions) کے صحیح استعمال پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔ انگریزی میں مثلاً Look into کا مطلب اور ہوتا ہے اور Look at کا معنی اور۔ تو میں نے جب یہ چیزیں انگریزی سیکھتے ہوئے محسوس کیں تو مجھے احساس ہوا کہ عربی کی تعلیم میں بھی مدارس کی اس پہلو سے مدد کرنی چاہیے۔ چنانچہ میں نے اپنی تصنیفات میں روزمرہ محاورات میں غلطیوں کی اصلاح کے لیے قل / لا تقل کا ایک سلسلہ رکھا ہے، یعنی یوں کہیے اور یوں نہ کہیے۔

۳۔ دوران تعلیم میں درسی کتابوں کے وہ نسخے استعمال کریں جو کتابت وطباعت کے جدید

معیار پر شائع کیے گئے ہیں۔ تعلیم کو دلچسپ اور پرکشش بنانے میں اس چیز کا بڑا دخل ہے۔ اس معاملے میں بھی دینی علوم کی مظلومیت کی ایک مثال دیکھیے۔ میں درس گاہ میں بیٹھا طالبات کو وفاق کے امتحان کے لیے 'شرح مائۃ عامل' پڑھا رہا تھا تو اس میں مجھے ایک بحث تلاش کرنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میں نے سوچا کہ میں مصنف ہوتے ہوئے اتنی دقت محسوس کر رہا ہوں تو طلبہ کا کیا حال ہوگا۔ اس وقت 'شرح مائۃ عامل' کا جو نسخہ بازار میں ملتا ہے، اس کی کتابت ۱۱۳ سال قبل کانپور میں ہوئی تھی اور آج بھی کراچی، ملتان اور لاہور کے تمام پبلشر اسی نسخے کا عکس چھاپتے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اس کتاب کو کمپیوٹر پر نئے سرے سے ٹائپ کرو اور اس کو نئی شکل دو۔ اس میں عوامل کو ایک چارٹ کی صورت میں واضح کرنے کے علاوہ، میں نے متن میں عوامل کو جلی کر دیا ہے اور کچھ اس کو سہل بنانے کی کوشش کی ہے، ورنہ اب تک اس کی جتنی شروح سامنے آئی ہیں، وہ اس کو منتہی درجے کی ایک مشکل کتاب بنا چکی ہیں۔

۴۔ آپ کو تربیت اساتذہ کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ جب تک آپ اساتذہ کی ٹریننگ کا بندوبست نہیں کرتے، اس وقت تک خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ تدریس زبان کی جدید تکنیک اور معاون ذرائع کے استعمال سے انہیں مناسب واقفیت ہونی چاہیے تاکہ وہ جدید مواد اور نصابی کتب کی بہتر طور پر تدریس کر سکیں۔ خود میں نے کتابیں لکھنے کے ساتھ ساتھ معلمین اور معلمات کی ٹیمیں بھی تیار کی ہیں۔ آپ کسی بھی شہر میں کہیں، ہم اپنے اساتذہ کی ٹیم بھیجنے کے لیے تیار ہیں جو عربی کے مدرسین کو پندرہ دن یا ایک ماہ کے دورانیے کے کورسز کروائیں گے۔ اس میں خود ان کو بھی عربی بولنے کی مشق کروائیں گے اور تدریس کے سلسلے میں ان کی پوری راہنمائی کریں گے۔ ابھی رمضان سے پہلے ہم نے دارالعلوم تعلیم القرآن اور دوسرے اداروں کے تیس مدرسین کو تیس روزہ کورس مکمل کروایا ہے اور اس قسم کے مزید کورسز کے لیے درخواستیں مسلسل آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ عام پڑھے لوگوں کے لیے ہم نے پچاس روزہ عربی کورس ترتیب دیا ہے جس میں وکلا، تاجر اور فوجی افسران وغیرہ عربی سیکھ رہے ہیں۔

۵۔ یہ تجاویز وفاق والوں کے سامنے بھی پیش کریں اور اگر وہ نہیں مانتے تو آپ خود مدارس

میں اس طریقے پر کام کرنا شروع کر دیں۔ ہم نے وفاق المدارس السّلفیہ کا چار سال کا نصاب تو الحمد للہ کوشش کر کے تبدیل کروا دیا ہے۔ اس کے صدر پروفیسر ساجد میر ہیں جو انگریزی کے پروفیسر ہیں اور ہمارے نقطہ نظر کو سمجھتے ہیں، اس لیے وہاں عربی کا نصاب ہم نے نیا نافذ کر دیا ہے۔ اسی طرح پنجاب یونیورسٹی نے حال ہی میں ایم اے عربی کے نصاب میں ہماری تیار کردہ چار کتابیں شامل کر لی ہیں، حالانکہ میں کبھی ان سے ملنے نہیں گیا۔ آپ بھی اس طریقے سے کام شروع کر دیں۔ جب اس کے فوائد سامنے آئیں گے، آپ کے طلبہ کی عربی کی استعداد اچھی ہو جائے گی اور وہ پرچے عربی میں حل کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو کسی نہ کسی مرحلے پر وفاق والوں کو بھی تبدیلی کرنا پڑے گی۔ آپ اخلاص سے کام شروع کریں گے تو یقیناً اس کے مثبت نتائج نکلیں گے۔

وفاق المدارس کے نصاب میں نئی ترامیم کے حوالے سے

دینی مدارس کے اساتذہ کے مابین ایک مذاکرہ

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ۳۔۴ دسمبر ۲۰۰۳ء کو دینی مدارس کے اساتذہ کے دو روزہ مشاورتی اجتماع کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف تعلیمی اداروں کے مندرجہ ذیل اساتذہ نے شرکت کی:

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ	مولانا زاہد الراشدی، مولانا محمد فیاض خان سواتی، مولانا ظفر فیاض، مولانا محمد عمار خان ناصر، مولانا محمد عرباض خان سواتی
مدرسہ اشرف العلوم گوجرانوالہ	مولانا عبد الواحد رسول نگری
دار العلوم مدنیہ لاہور	مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی
جامعہ فتاح العلوم گوجرانوالہ	مولانا حافظ احمد اللہ خان
جامعہ قاسمیہ گوجرانوالہ	مولانا قاری گلزار احمد قاسمی، مولانا حامد گلزار قاسمی
جامعہ حقانیہ گوجرانوالہ	مولانا محمد یعقوب تبسم، مولانا ظہیر الدین بابر
جامعہ اسلامیہ کامونکی	مولانا عبد الرؤف فاروقی
جامعہ حنفیہ تعلیم الاسلام جہلم	مولانا قاری ظفر اقبال، مولانا حافظ محمد ابوبکر جہلمی
جامعہ حنفیہ قادریہ لاہور	مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر، مولانا ذکاء الرحمٰن اختر

جامعہ عربیہ چنیوٹ	مولانا مشتاق احمد چنیوٹی
جامعہ فاروقیہ سیالکوٹ	مولانا حماد انذر قاسمی
معہد اللغۃ العربیۃ اسلام آباد	مولانا محمد بشیر سیالکوٹی
الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ	مولانا حافظ محمد یوسف، مفتی محمد عامر، مولانا احسن ندیم، مولانا عبد الحمید، پروفیسر میاں انعام الرحمٰن، پروفیسر حافظ منیر احمد

اجتماع کی پہلی نشست کی صدارت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے سینئر ایڈیٹر پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے کی جس میں شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے ''درس نظامی کی اہمیت وافادیت'' پر مقالہ پیش کیا۔ دوسری نشست کی صدارت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی جس میں پروفیسر ڈاکٹر محمد امین نے ''طلبہ کی دینی واخلاقی تربیت'' کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔ تیسری نشست جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبد الرؤف فاروقی کی زیر صدارت منعقد ہوئی جس میں شرکاے اجلاس نے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے ترمیم شدہ نصاب کے بارے میں اظہار خیال کیا جبکہ چوتھی اور آخری نشست کی صدارت مولانا زاہد الراشدی نے کی اور اس میں معہد اللغۃ العربیۃ اسلام آباد کے مولانا محمد بشیر سیالکوٹی نے ''دینی مدارس میں عربی کی تعلیم کا منہج اور ضروری اصلاحات'' کے عنوان پر اظہار خیال کیا اور مولانا زاہد الراشدی نے ''فکری اور مسلکی تربیت کے چند اہم پہلو'' کے عنوان پر گفتگو کی۔

وفاق المدارس العربیہ کے ترمیم شدہ نصاب کے بارے میں نشست کی مختصر روداد درج ذیل ہے:

ترامیم کا خلاصہ

الشریعہ اکادمی کے ڈپٹی ڈائریکٹر اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے استاذ مولانا محمد عمار خان ناصر نے نئی ترامیم کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ نئے نصاب میں چار طرح کی تبدیلیاں رو بہ عمل لائی گئی ہیں:

۱۔ بعض نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے، مثلاً:

☆ سیرت وتاریخ، جس کے تحت ثانویہ خاصہ سال اول میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ''مختصر تاریخ اسلام'' اور عالیہ سال اول میں ابراہیم شریقی کی ''التاریخ الاسلامی'' پڑھائی جائے گی۔

☆ علوم القرآن، جس کے تحت عالمیہ سال اول میں الشیخ محمد علی الصابونی کی ''التبیان فی علوم القرآن'' پڑھائی جائے گی۔

☆ جدید فقہی مسائل، جس کے تحت عالمیہ سال اول میں مولانا محمد تقی عثمانی کی ''اسلام اور جدید معیشت وتجارت'' پڑھائی جائے گی۔

☆ مقارنۃ الادیان والفرق، جس کے تحت عالمیہ سال اول میں مولانا اللہ وسایا کی ''آئینہ قادیانیت'' پڑھائی جائے گی۔

۲۔ بعض مضامین میں سابقہ کتب کی جگہ نئی کتب شامل کی گئی ہیں، مثلاً:

☆ عالیہ سال اول میں فلسفہ قدیم کی ''میبذی'' کی جگہ ''ہدیہ سعیدیہ'' اور ''ہدایۃ الحکمۃ''، جبکہ عربی ادب میں ''دیوان المتنبی'' کی جگہ ''مختارات من ادب العرب'' پڑھائی جائے گی۔

☆ عالیہ سال دوم میں حدیث کے مضمون میں ''کتاب الآثار'' کی جگہ ''موطا امام محمد'' اور ''مسند امام اعظم'' کو شامل کیا گیا ہے۔

۳۔ زیادہ تر مضامین میں پہلے سے پڑھائی جانے والی کتب کے ساتھ معاون کتب کا اضافہ کیا گیا ہے، چنانچہ:

☆ ثانویہ عامہ سال اول میں نحوی قواعد کی تمرین کے لیے ''المنہاج فی القواعد والاعراب، النحو الیسیر اور تسہیل النحو'' شامل کی گئی ہیں۔

☆ ثانویہ عامہ سال دوم میں ''ہدایۃ النحو'' کے ساتھ تمرینات از ''تسہیل الادب'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔

☆ ثانویہ خاصہ سال اول میں ''اصول الشاشی'' سے قبل ''آسان اصول الفقہ'' کو شامل کیا

گیا ہے۔

☆ ثانویہ خاصہ سال دوم کے نصاب میں علم بلاغت کی دو کتابوں ''دروس البلاغۃ'' اور ''تلخیص المفتاح'' کا اضافہ کیا گیا ہے جو عالیہ سال اول میں ''مختصر المعانی'' کی تعلیم کے لیے بنیاد کا کام دیں گی۔

☆ عالیہ سال اول میں عقائد کے مضمون میں ''الانتباہات المفیدۃ'' کا جبکہ سال دوم میں ''العقیدۃ الطحاویۃ'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس درجے میں اصول حدیث میں ''خیر الاصول'' اور علم الفرائض میں ''سراجی'' کے ساتھ ''تسہیل الفرائض'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

☆ عالمیہ سال اول میں ''ہدایۃ'' کے ساتھ اصول افتا پر ''شرح عقود رسم المفتی'' شامل کی گئی ہے۔

۴۔ بعض کتب کو ترتیب میں مقدم اور موخر کیا گیا ہے۔ مثلاً:

☆ اصول تفسیر کی کتاب ''الفوز الکبیر'' کو، جو قبل ازیں عالیہ سال اول میں پڑھائی جاتی تھی، عالیہ سال دوم کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

☆ ''موطا امام محمد'' کو، جو عالمیہ سال دوم کے نصاب میں تھی، عالیہ سال دوم میں شامل کر دیا گیا ہے۔

۵۔ بعض کتابیں نصاب سے بالکل خارج کر دی گئی ہیں جن میں عالیہ سال اول میں علم منطق کی ''سلم العلوم''، عربی شاعری کی ''دیوان المتنبی''، جبکہ عالیہ سال دوم میں قدیم فلسفہ کی ''میبذی'' شامل ہیں۔ اسی طرح عالمیہ سال اول سے علم بلاغت کی کتاب ''مطول'' خارج کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد مذاکرہ کے شرکا نے فرداً فرداً ان تبدیلیوں کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مولانا مشتاق احمد (جامعہ عربیہ چنیوٹ)

☆ عربی زبان وادب کی تدریس کے لیے نئے نصاب میں نسبتاً بہتر کتابیں شامل کی گئی ہیں، لیکن اس سے عربی بول چال کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے

کہ تدریس، مدرسے کی حدود میں گفتگو اور امتحانی پرچوں کے حل کے لیے عربی کو لازم قرار دے دیا جائے۔

☆ عقائد میں شامل کی جانے والی کتب نئی ضروریات کے حوالے سے ناکافی ہیں۔ اس ضمن میں نصابی ضروریات کے پیش نظر ایک نئی کتاب مرتب کروانے کی ضرورت ہے۔

☆ قدیم فلسفہ میں ''میبذی'' کی ''ہدیہ سعیدیہ'' کو شامل کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ معاملہ جوں کا توں رہتا ہے۔ ''الانتباہات المفیدۃ'' عقلی استدلال کے حوالے سے نہایت مفید ہے لیکن اس کے لیے خود استاذ کو گہرے مطالعہ اور غیر معمولی تیاری کی ضرورت ہے۔

☆ مقارنۃ الادیان والفرق کا اضافہ خوش آئند ہے۔

☆ تاریخ سے علما وطلبا کی شناسائی کی صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ اس ضمن میں تاریخ کو باقاعدہ نصاب میں شامل کرنا اچھا اقدام ہے۔

☆ ''سلم العلوم'' کی طرح کی کتابوں کا اخراج بھی مثبت قدم ہے۔

مفتی محمد عامر (الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ)

☆ عربی صرف ونحو کی موجودہ کتابیں اور طرز تعلیم مطلوبہ استعداد پیدا نہیں کرتیں اور درجہ رابعہ تک مسلسل عربی قواعد پڑھنے کے باوجود عربی سے مناسب شناسائی نہیں ہو پاتی، جس کی وجہ یہ ہے کہ ''کافیہ'' اور ''شرح جامی'' وغیرہ کتابوں میں غیر ضروری طویل بحثیں کی جاتی ہیں۔ ''علم الصیغہ'' فارسی کی جگہ اردو کو شامل نصاب کرنا چاہیے۔ اسی طرح ''کافیہ'' اور ''شرح جامی'' کی جگہ دوسری سہل اور مفید کتابیں شامل کرنی چاہییں۔

☆ قدیم عربی زبان وادب کے حوالے سے تو بعض تبدیلیاں کی گئی ہیں لیکن جدید عربی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہمارے علما وطلبا جدید عربی ذخیرے سے استفادہ کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح بول چال اور تحریر وتقریر میں عربی زبان کے استعمال کی صورت حال پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ کراچی کے اکثر مدارس میں معہد اللغۃ العربیہ قائم ہے جس سے استفادہ کرنے والے طلبہ عربی زبان میں پرچے حل کرتے ہیں اور اس طرح امتحانات میں اچھی پوزیشنیں حاصل کرتے ہیں۔

☆ مدارس کے طلبہ کا اردو تلفظ، املا اور استعمال بھی کافی کمزور ہے، اس لیے اردو زبان کو بھی بطور مستقل مضمون کے شامل نصاب کرنا چاہیے۔

مولانا حافظ محمد ابوبکر (جامعہ حنفیہ جہلم)

☆ درس نظامی کا کورس پہلے ہی کافی طویل ہے اور اس کے دورانیے میں اضافہ نئے آنے والے طلبہ کے لیے مزید توحش کا باعث بنے گا۔

مولانا عبدالحمید (چارسدہ)

☆ جدید عربی کو بھی نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ معیشت وتجارت کے حوالے سے اسلامی احکام وقوانین کے ساتھ ساتھ جدید معاشیات کو بطور مستقل مضمون کے نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔

مولانا احسن ندیم (الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ)

☆ عربی زبان کی تعلیم کے حوالے سے قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ میٹرک تک جدید تعلیم کو، اختیاری درجے میں ہی سہی، شامل نصاب کرنا مستحسن اقدام ہے۔ اسی طرح بی اے کی سطح تک جدید تعلیم کو بھی نصاب میں شامل کرنا چاہیے۔ جس طرح میٹرک کے لیے ایک سال الگ مخصوص کر دیا گیا ہے، اسی طرح ہر مرحلے کی تکمیل پر اگلے مرحلے میں داخلے سے قبل ایک سال مساوی جدید تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ مثلاً عالیہ سے قبل ایف اے اور عالمیہ سے قبل بی اے مکمل کرنا ضروری قرار دیا جائے۔

☆ اردو زبان وادب کو بھی باقاعدہ نصابی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔

مولانا محمد عمار خان ناصر (مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

☆ عربی زبان وادب کی تعلیم کے لیے کیے جانے والے اضافے اور تبدیلیاں یقیناً مثبت ہیں، تاہم چند مزید پہلوؤں پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ بعض کتابیں مفید ہونے کے باوجود

غلط جگہ پر رکھے جانے کے باعث الٹا مشکل کا باعث بن جاتی ہیں۔ مثلاً نئے نصاب میں عربی نحو کی تمرین کے لیے ''المنہاج فی القواعد والاعراب'' کو ثانویہ عامہ سال اول میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں عربی جملوں کی فنی تحلیل جس سطح پر کی گئی اور اس کے لیے قرآن اور اشعار سے جن مثالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کے لحاظ سے اسے ''شرح جامی'' کے بھی بعد پڑھایا جانا چاہیے۔ موجودہ ترتیب میں اس کتاب سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

☆ اسی طرح کی صورت حال ''معلم الانشاء'' کے حوالے سے درپیش ہے جو عربی ترجمہ وانشا کی مشق کے لیے ایک مفید کتاب ہے لیکن اس سے قبل طالب علم کے پاس عربی الفاظ ومحاورات کا مناسب ذخیرہ ہونا چاہیے جنہیں وہ جملوں میں استعمال کرنے کی مشق کر سکے۔ ندوۃ العلماء لکھنو کے نصاب میں اسی وجہ سے ''معلم الانشاء'' کو عربی نظم ونثر کا اچھا خاصا ذخیرہ پڑھانے کے بعد رکھا گیا ہے، جبکہ ہمارے ہاں اس کی تعلیم کا آغاز ثانویہ عامہ سے کر دیا جاتا ہے جب طالب علم ابھی عربی جملوں کی ساخت اور محاوروں سے مناسب طور پر مانوس نہیں ہوا ہوتا۔ چنانچہ عملاً یہ کتاب طلبہ میں ترجمہ اور انشا کی کوئی صلاحیت پیدا نہیں کرتی بلکہ اساتذہ مشقوں کا ترجمہ ازخود بنا کر طلبہ کو دے دیتے ہیں جنہیں رٹ کر طلبہ امتحان میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

☆ عربی نظم کا کچھ حصہ تو قدیم جاہلی ادب کی صورت میں داخل نصاب ہے، لیکن نثر کا حصہ ناکافی ہے۔ اس ضمن میں ''دیوان المتنبی'' کی جگہ ''مختارات من ادب العرب'' کا شامل کیا جانا قابل تحسین ہے۔ لیکن عربی نثر کی تعلیم کے طریقے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ طریقے میں متن کا لفظی یا بامحاورہ ترجمہ یاد کرانے پر اکتفا کی جاتی ہے، لیکن متن میں استعمال ہونے والے الفاظ، محاورات اور تراکیب کو طالب علم کے لسانی ذخیرہ کا حصہ بنانے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ تعلیم زبان کے جدید طریقے میں متن کے مطالعہ کو مفید اور موثر بنانے کے لیے لسانی اصولوں پر مبنی مختلف مشقیں تیار کی جاتی ہیں جو زبان کے فہم اور استعمال پر گرفت پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ''القراءۃ الراشدہ، نفحۃ العرب، مختارات اور ریاض

الصالحین'' کے شامل نصاب حصوں پر اس نوعیت کی جامع مشقیں تیار کروا کر اساتذہ کو فراہم کی جائیں اور اس طریقے کو تدریسی نظام کا باقاعدہ حصہ بنایا جائے۔

مولانا ذکاء الرحمٰن اختر (جامعہ حنفیہ لاہور)

☆ نصاب میں موجودہ تبدیلیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بارے میں پایا جانے والا جمود ٹوٹ رہا ہے اور اہل نظر کافی عرصہ سے جس نظر ثانی کا مشورہ دے رہے تھے، اس کی اہمیت کا احساس کیا جانے لگا ہے۔

☆ جدید علوم میں معیشت کے ساتھ ساتھ دوسرے سماجی علوم مثلاً سیاسیات، علم معاشرہ اور نفسیات وغیرہ کو بھی شامل کیا جائے۔

☆ مقارنۃ الادیان میں آئینہ قادیانیت پر اکتفا درست نہیں۔ دیگر معاصر فتنوں کے حوالے سے بھی مواد شامل نصاب ہونا چاہیے۔

قاری جمیل الرحمٰن اختر (جامعہ حنفیہ لاہور)

☆ نصاب میں کی جانے والی تبدیلیاں بلاشبہ درست سمت میں اقدام ہے، لیکن اصل مسئلہ اساتذہ کی تربیت کا ہے۔ ایک اچھے نصاب کی تدریس کے لیے اگر ماہر اور تربیت یافتہ اساتذہ میسر نہ ہوں تو کیا فائدہ؟ یہ تربیت تعلیم وتدریس کے حوالے سے بھی ہونی چاہیے، اخلاق وکردار کے حوالے سے بھی اور اس حوالے سے بھی کہ اساتذہ کو آگے طلبہ کی تربیت کیسے کرنی ہے۔ اساتذہ کی نئی پود میں اپنی یا طلبہ کی تربیت کی اہمیت کا احساس نہ ہونے کے برابر ہے اور بسا اوقات ان کا رویہ ناگوار اثرات پیدا کرتا ہے۔ وفاق المدارس کو نئے حالات کے تحت تربیت اساتذہ کا بھی باقاعدہ نظام وضع کرنا چاہیے، جیسا کہ افتا کی تربیت کے لیے ایک باقاعدہ نظام بنالیا گیا ہے۔

مولانا حماد انذر قاسمی (جامعہ فاروقیہ سیالکوٹ)

☆ مدارس میں عربی زبان کا معیار تعلیم بہتر کرنے کے لیے سب سے پہلے خود اساتذہ کا معیار بہتر کرنا ہوگا۔ اگر اساتذہ ہی عربی بول چال اور تحریر وتقریر پر قدرت نہیں رکھتے تو طلبہ میں یہ

صلاحیت کیسے پیدا ہوگی؟

☆ قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی پر بھی بھرپور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ قدیم اعتقادی فرقوں کے ساتھ ساتھ جدید علمی واعتقادی فتنوں سے واقفیت بھی طلبہ کو بہم پہنچائی جانی چاہیے اور ان کی ایسی فکری تربیت ہونی چاہیے کہ وہ عملی میدان میں ان فتنوں کے پیدا کردہ شبہات کا موثر جواب دے سکیں۔ اس حوالے سے کسی خاص درجے کے نصاب میں کوئی ایک آدھ کتاب شامل کر دینے کے بجائے اساتذہ کو ایسا مواد فراہم کیا جائے جس کی بنیاد پر وہ تسلسل کے ساتھ تمام طلبہ کی ذہنی اور فکری تربیت کر سکیں۔

☆ اساتذہ کے لیے طلبہ کی نفسیاتی ساخت اور صلاحیتوں سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے، اس لیے اساتذہ کو تعلیمی نفسیات کے مضمون کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہیے اور طلبہ کے ساتھ شفقت ومحبت پر مبنی شخصی تعلق قائم کر کے ان کی فکری وعملی تربیت کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆ اساتذہ کے انتخاب میں معیار کی حیثیت علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ تدریسی صلاحیت اور اخلاق وکردار کو حاصل ہونی چاہیے۔ اقرا تعلیم الاطفال کے نظام میں تربیت اساتذہ کے نظام ہی کی بدولت اچھے تعلیمی نتائج حاصل ہو رہے ہیں۔

مولانا قاری ظفر اقبال (جامعہ حنفیہ جہلم)

☆ درس نظامی کے موجودہ نصاب کو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص قبولیت حاصل ہے، اگرچہ اس میں ضروریات کے لحاظ سے تبدیلیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔ جدید تعلیم کو میٹرک کی سطح تک شامل کرنا تو قابل قبول ہے لیکن اس سے زائد اسے جگہ دینا دینی تعلیم کو مغلوب کرنے کے مترادف ہوگا۔

☆ اصل ضرورت تربیت اساتذہ کی ہے۔ اس سے پہلے اسی نصاب سے اچھے طلبہ تیار ہوتے رہے ہیں، کیونکہ اساتذہ محنتی اور قابل تھے۔ اصل خامی نصاب میں نہیں بلکہ طریق تدریس میں ہے۔

☆ بعض کتابوں پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً ''شرح جامی'' عربی عبارت میں

مہارت پیدا کرنے کے لیے بے نظیر ہے۔اسی طرح ''شرح عقائد'' کے آخری حصے میں بہت سے جدید اعتقادی فتنوں کی تردید کے لیے بھی مواد موجود ہے۔

☆ جدید عربی اور عربی بول چال کی فی الواقع نہایت کمی ہے لیکن اس کی تلافی بھی اساتذہ کی تربیت کے بغیر نہیں کی جاسکتی۔

☆ استاذ کے لیے علمی وتدریسی قابلیت، اعتقادی اصلاح اور اخلاقیات کے لحاظ سے ایک معیار متعین ہونا چاہیے کیونکہ استاذ کے نظریات اور کردار کے اثرات طلبہ پر پڑتے ہیں۔اساتذہ کو یہ حقیقت جاننی چاہیے کہ دینی تعلیم کا خاصہ ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی کی جائے۔

مولانا حافظ محمد یوسف (الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ)

☆ اسلامی معاشی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جدید معیشت کے اصول وضوابط اور جدید سیاسی نظام کا مطالعہ بھی شامل نصاب کیا جائے۔ اسی طرح دیگر سماجی علوم پڑھا کر طلبہ میں جدید معاشرے کی ضروریات کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ وہ مدرسے اور مسجد کے ماحول تک محدود رہنے کے بجائے عام زندگی کے شعبوں میں بھی اپنی جگہ بنا سکیں۔

☆ گمراہ مذاہب اور فرقوں کا تعارف اور اسی طرح تاریخ اسلام کسی خاص درجے کے بجائے درجہ ثالثہ کے بعد مسلسل پڑھائے جائیں۔سیرت اور تاریخ کے وہ پہلو جن پر مستشرقین وغیرہ کے اعتراضات ہیں، ان پر خاص توجہ دی جائے۔

☆ جدید تعلیم بورڈ کے نصاب کے مطابق مکمل دی جائے اور اس کا باقاعدہ امتحان بھی بورڈ سے دلوایا جائے۔اس ضمن میں میٹرک کی سطح پر صرف انگریزی اور ریاضی مسلسل پڑھانے کی ضرورت ہے۔باقی مضامین کی تیاری آخری ایک دو ماہ میں آسانی کروائی جاسکتی ہے۔

☆ درس نظامی کو تدریج کے اصول پر مختلف مراحل میں تقسیم کرنا چاہیے۔ بنیادی مضامین آغاز کے درجوں میں پڑھائے جائیں اور مشکل علوم وفنون کو بعد کے مراحل میں شامل کیا جائے۔ اس طرح طلبہ کو یہ سہولت دی جائے کہ وہ اپنی صلاحیت اور رجحان کے مطابق جس مرحلہ کی تکمیل پر تعلیم کو چھوڑنا چاہیں، چھوڑ سکیں۔

مولانا زاہد الراشدی (مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

☆ اساتذہ کی تربیت، عربی بول چال اور تحریر کی صلاحیت اور جدید اعتقادی فتنوں سے واقفیت کے حوالے سے جو تجاویز سامنے آئی ہیں، مجھے ان سے اتفاق ہے۔

☆ اس کے ساتھ میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جدید عالمی حالات اور مغربی فکر و فلسفہ کو بھی بطور مضمون مدارس میں پڑھایا جانا چاہیے۔

مولانا عبدالرؤف فاروقی (جامعہ اسلامیہ کامونکی)

☆ نصاب میں عربی زبان و ادب، عقیدہ، جدید معیشت، تاریخ اور مقارنۃ الادیان کے حوالے سے کیے جانے والے اضافے اور تبدیلیاں یقیناً درپیش ضروریات کے حوالے سے مثبت ہیں، لیکن معیار تعلیم کو بہتر بنانے کے ان پر انحصار کافی نہیں۔ ایک عمومی مسئلہ یہ ہے کہ ان مضامین کو بہتر انداز میں پڑھانے والے اساتذہ کیا ہر سطح پر مدارس کو میسر ہیں؟ علاوہ ازیں نظام تعلیم میں فن کو بطور فن سمجھنے اور پڑھنے کے بجائے محض امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کا رجحان فروغ پا چکا ہے۔ ہر سطح پر کتابوں کے تراجم، شروح اور امتحان کے لیے منتخب مقامات کی تیاری میں مدد دینے والی کتابیں عام ہو چکی ہیں۔ اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی تلافی کتابوں میں اضافے یا تبدیلی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے اساتذہ کے معیار اور طریق تدریس کو بہتر بنانا ہوگا۔

☆ جدید تعلیم کے حوالے سے ایک واضح اور شعوری رویہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر جدید علوم دینی نظام کے لیے نقصان دہ ہیں تو حکومتی دباؤ کو بالکل مسترد کر دینا چاہیے، چاہے اس کے لیے کوئی بھی قربانی دینی پڑے۔ لیکن اگر یہ علوم کسی نہ کسی درجے میں علما کی ضرورت ہیں تو پھر اس کے حوالے سے ہر دو چار سال کے بعد بیرونی دباؤ پر ہنگامی فیصلے کرنے کے بجائے تعلیمی ضروریات کے حوالے سے ایک مستقل اور جامع پالیسی وضع کی جائے۔ موجودہ نصاب میں میٹرک کی سطح تک تعلیم کو بے دلی سے جگہ دی گئی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ میٹرک کی تعلیم بھی، اگر دی گئی تو، اسی پست معیار پر دی جائے گی جس پر ہم مڈل کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہماری بہت عرصے سے یہ تجویز ہے کہ داخلے کے لیے میٹرک کو شرط قرار دے کر چھ سال میں درس نظامی کو

مکمل کروایا جائے۔

☆ مقارنۃ الادیان وغیرہ پر کتابوں کو داخل نصاب کرنے کے بجائے موضوع کے ماہرین سے لیکچرز دلوائے جائیں اور تفصیلی مطالعہ کے لیے متعلقہ کتابوں کی طرف رہنمائی کر دی جائے۔

☆ اساتذہ اور طلبہ کی تربیت کا مسئلہ سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ دینی مدارس کا نظام تربیت، سلیقہ مندی، اخلاقیات اور نظم وضبط کے لحاظ سے دیوالیہ پن کے قریب پہنچ چکا ہے۔

نصاب کے حوالے سے چند تجاویز

مولانا مشتاق احمد کا مکتوب گرامی

باسمہ سبحانہ

بخدمت گرامی قدر مخدومی حضرت علامہ زاہد الراشدی مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی؟

۸، ۹ شوال کو الشریعہ اکیڈمی میں منعقدہ دینی مدارس کے اساتذہ کرام کے مشاورتی اجتماع کے حوالے سے ایک بات مزید عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اگر وفاق المدارس سے وابستہ اہم علمی شخصیات 'میبذی' اور 'ہدیہ سعیدیہ' وغیرہ کتب کو امام رازی وغزالی کی تصنیفات کو سمجھنے کے لیے ضروری خیال کرتی ہیں تو ان کی شخصیات وآرا اپنی جگہ مسلم ومحترم ہیں، لیکن ان سے یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہر ہر طالب علم پر میبذی/ہدیہ سعیدیہ کا پڑھنا لازم کرنے کے بجائے اردو میں فلسفہ کے کسی سینئر استاد سے عام فہم اور جامع مانع انداز میں ایک کتاب لکھوا کر بطور تعارف شامل نصاب کر دی جائے جس سے پرانے فلسفہ کو سمجھنا آسان ہو۔ نیز اس میں یہ بھی مذکور ہو کہ جدید سائنسی تحقیقات نے پرانے فلسفہ کے کس کس پہلو کو بیکار ثابت کر دیا ہے۔ ہدیہ سعیدیہ اور میبذی کی تعلیم وتعلم کو فرض عین قرار دینے کے بجائے اگر اس طرز کی اردو کتاب شامل نصاب کر دی جائے تو یہ پرانے فلسفہ کی بہتر خدمت ہوگی اور اس کو پڑھانے کی غرض وغایت بھی احسن طریق سے پوری ہو سکے گی۔ اگر یہ کتاب دو تین حضرات سے مشترکہ طور پر لکھوائی جائے تو بہتر ہوگا۔

الشریعہ اکیڈمی کے مذکورہ پروگرام (دینی اساتذہ کرام کی مجلس مشاورت) کے حوالے سے

چند باتیں عرض ہیں:

۱۔اس پروگرام کو سالانہ حیثیت دیں اور زیادہ انحصار گوجرانوالہ کے دینی مدارس پر نہ ہو بلکہ دوسرے شہروں کے دینی مدارس پر ہو۔ 'گھر کی مرغی دال برابر' کے مصداق مقامی حضرات کسی بھی شخصیت اور پروگرام کی ناقدری کرتے ہیں۔اس ناقدری کا مشاہدہ گزشتہ پروگرام میں بخوبی ہوا ہے۔

۲۔دو یا تین دن کا جو پروگرام بھی ہو، بھرپور ہو۔صبح سے رات گئے تک مصروفیات ہوں۔ مولانا قاضی حمید اللہ خان مدظلہ جیسے سینئر مدرسین کو بھی دعوت دی جائے جو کہ مختلف فنون پڑھانے کے متعلق اپنے تجربات سے رہنمائی فرمائیں اور ہر فن کے پڑھانے کا جو مخصوص طریقہ ہے، اس کی نشان دہی کریں۔

۳۔مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کا جدید عربی کا پروگرام ایک ہفتہ کا ضرور رکھیں۔ایک ہزار روپے فیس ہوگی تو صرف قدر دان ہی آ سکیں گے، قدر ناشناسوں سے جان چھوٹ جائے گی۔البتہ آپ کو میز بانی کا بار گراں اٹھانا پڑے گا۔اس پروگرام کی بہت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

۴۔آئندہ پروگراموں میں مجالس مذاکرہ کے چند مجوزہ عنوانات درج ذیل ہیں:

(الف) علمائے کرام میں مطالعہ وتحقیق کے ذوق کی کمی کے وجوہ

(ب) معاشرہ پر علمائے کرام کے اثرات کی کمی کے وجوہ، بالفاظ دیگر معاشرہ اور علمائے کرام میں بڑھتی ہوئی خلیج کے اسباب

(ج) دور حاضر کے جدید تقاضے جو کہ علمائے کرام کی فوری توجہ چاہتے ہیں

امید واثق ہے کہ آپ مذکورہ عنوانات اور دیگر اہم موضوعات پر مجالس مذاکرہ کا اہتمام فرماتے رہیں گے۔

”دینی مدارس میں عمرانی علوم کی تدریس کی ضرورت واہمیت“

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے زیر اہتمام فکری نشست

(منعقدہ ۲ جنوری ۲۰۰۵ء)

مغرب کا فکری وتہذیبی چیلنج اور علما کی ذمہ داریاں

ـــــ ڈاکٹر محمود احمد غازی ـــــ

[سابق صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد]

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم وعلی آله و اصحابه اجمعین

قابل احترام جناب مولانا زاہد الراشدی، علماء کرام، برادران محترم، عزیز طلباء کرام!

سب سے پہلے میں آپ سب حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے عزت بخشی، یہاں حاضری کا موقع عطا فرمایا اور اپنے بعض ناچیز خیالات پیش کرنے کی ا جازت دی۔

برادران محترم! اس وقت دنیاے اسلام جس دور سے گزر رہی ہے، یہ دور اسلام کی تاریخ کا انتہائی مشکل دور ہے۔ امت مسلمہ کو جو مشکلات آج درپیش ہیں، شاید ماضی میں اتنی مشکلات کبھی درپیش نہیں ہوئیں۔ ایک اعتبار سے امت مسلمہ کی پوری تاریخ بحرانوں کی تاریخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے آغاز سے لے کر، جب آپ دار ارقم میں قیام فرما تھے، آج تک کوئی صدی، اور صدی کا کوئی حصہ یا کوئی عشرہ ایسا نہیں گزرا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لیکن ان ساری مشکلات میں اور آج کی مشکل میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ ماضی کی جتنی مشکلات اور پریشانیاں تھیں، وہ عموماً زندگی کے کسی

ایک گوشے تک محدود ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا، پیچھے ہٹنا پڑا، پسپائی اختیار کرنا پڑی، یہ ایک عسکری شکست یا عسکری ہزیمت کا معاملہ تھا۔ یا مسلمانوں کی کوئی حکومت کمزور ہوئی، غیر ملکی قوتیں مضبوط ہوگئیں اور مسلمان سیاسی طور پر پس ماندگی کا شکار ہوئے، یہ سیاسی میدان میں کمزوری تھی۔ اس طرح کی کمزوریاں جو عموماً سیاسی، مالی، عسکری یا مادی ہوتی تھیں، تقریباً ہر دور میں پیش آتی رہیں، لیکن ان سارے ادوار میں مسلمانوں کا خاندان، مسلمانوں کی تعلیم، مسلمانوں کا نظام تربیت اور مسلمانوں کی جو اندرونی ساخت اور تشکیل (Internal fabric) تھی، وہ اکثر و بیشتر بیرونی خطرات اور حملوں سے محفوظ رہی۔ تاتاریوں کے حملے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیاے اسلام پر اس سے برا وقت کوئی نہیں آیا، اور یقیناً وہ بہت برا وقت تھا کہ افغانستان کے مشرقی علاقوں سے لے کر مصر کے حدود تک اور ترکی کے جنوبی علاقوں سے لے کر جزیرۃ العرب کے وسط تک، یہ سارا علاقہ تاتاریوں کی تاخت وتاراج کی آماجگاہ تھا۔ انھوں نے ہزاروں علماے کرام کو شہید کیا اور بڑے بڑے جید ترین اکابر اسلام ان کی تلوار کا نشانہ بنے۔ خواجہ فریدالدین عطار، جن کے بارے میں مولانا رومؒ نے فرمایا:

عطار او بود وسینائی دو چشم او

ما از پئے سینائی وعطار آمدیم

اس درجے کے انسان کہ جن کی پیروی پر مولانا روم جیسے آدمی نے فخر کا اظہار کیا ہے، ایسے اونچے اونچے لوگ تاتاریوں کی تلوار کا شکار ہوئے۔ کتب خانے انھوں نے جلا دیے، شہر برباد کر دیے، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور کتاب 'البدایہ والنہایہ' میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی شکست خوردگی اور پست ہمتی کا یہ عالم تھا کہ 'اذا قیل لك ان التتار انهزموا فلا تصدق'، یعنی اگر تمھیں یہ خبر دی جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی ہے تو اس پر یقین نہ کرو۔ گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور سمجھی جاتی تھی اور یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی۔ لیکن اس ساری تباہی اور بربادی کے باوجود تاتاریوں کی شکست وریخت کا دار ومدار سارا کا سارا مسلمانوں کی عسکری اور سیاسی کمزوری پر تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سیاسی نقصان پہنچایا، عسکری نقصان پہنچایا،

لیکن ان کے پاس کوئی دین نہیں تھا، کوئی پیغام نہیں تھا، کوئی تہذیب نہیں تھی، کوئی مذہب نہیں تھا، کوئی فکری ایجنڈا نہیں تھا، اس لیے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، تربیت اور خاندانی نظام ان کے حملوں سے محفوظ رہا اور ان میں سے کوئی چیز متاثر نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی اندرونی قوت نے ان کا ساتھ دیا اور بہت جلد وہ تاتاریوں کی شکست کے نتائج اور ثمرات بد سے نکلنے میں کام یاب ہو گئے۔ یہی کیفیت بقیہ بہت سے معاملات کی بھی رہی۔

آج جو صورت حال درپیش ہے، اور آج سے نہیں، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہر آنے والا دن، ہر نکلنے والا سورج خطرے کی یا پریشانی کی ایک نئی جہت لے کر آتا ہے۔ آج اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خطرات سے دوچار نہ ہو۔ فرد کے ذاتی کردار اور تربیت کا معاملہ ہو، گھر کے اندر ماں اور بچوں کے درمیان کا معاملہ ہو، میاں بیوی کے تعلقات کا معاملہ ہو، گھر کی خواتین کے رویے کا معاملہ ہو، تعلیم وتربیت کا معاملہ ہو، یا مساجد کے جاری اندر سرگرمیوں اور معمولات کا معاملہ ہو، ان میں سے ہر چیز آج براہ راست مغربی حملے کی زد میں ہے۔ تاتاریوں نے شاید کبھی یہ نہیں پوچھا ہوگا کہ جامعہ ازہر میں کیا پڑھایا جا رہا ہے، مسلمانوں کی نصاب کی کتابوں میں کیا لکھا جا رہا ہے یا فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے کبھی یہ چیز زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح انگریز جب شروع میں یہاں آئے تو انھوں نے بھی ان معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کے ڈیڑھ دو سو سال یہاں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اندرونی ساخت بڑی حد تک (by and large) مغربی اثرات سے محفوظ رہی اور ایسے لوگ ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں کروڑوں تھے جن کی زندگی کا ایک لمحہ یا ایک گوشہ بھی انگریزی اثرات سے متاثر نہیں ہوا۔

میرے خاندان کے ایک بزرگ تھے، حافظ محمد اسماعیل جو بڑے عالم اور محدث تھے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کے والد تھے اور رشتے میں میرے والد کے چچا تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہندوستان میں پہلے شاید ٹماٹر نہیں ہوتا تھا، بعد

میں جب یہاں ٹماٹر آیا تو یہ لفظ شاید انگریزی کے tomato کی اردو شکل تھی۔ حافظ اسماعیل صاحب ٹماٹر کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی یہ لفظ بولتا تھا تو اس پر ناخوشی کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے اس کا نام لال بینگن رکھا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ ایک دن گھر میں انھوں نے پوچھا کہ سالن میں کیا ڈالا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ ٹماٹر ڈالا ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے کہ نصرانیت میرے گھر میں گھس آئی؟ اس کو لال بینگن کیوں نہیں کہتے؟

بظاہر یہ بات آج ہمیں لطیفہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ اتنی شدت کے ساتھ مغربی اثرات میں رکاوٹ پیدا نہ کرتے تو مغربی اثرات آج سے سو سال پہلے اسی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے جیسا کہ آج گھستے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں ایک دو نہیں، ہزاروں ہیں اور سیکڑوں، لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسان ایسے ہیں جنھوں نے مغربی اثرات کے خلاف مزاحمت کی اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے مغرب کی مثبت چیزوں کو بھی روکا۔ یقیناً بعض باتیں مغرب میں مثبت بھی تھیں جن کے ثمرات سے مسلمان محروم رہے، لیکن آج یہ بات کہنا اور تبصرہ کرنا تو بڑا آسان ہے کہ فلاں بزرگ نے پابندی لگا دی تھی اور مغربی اثرات کے ثمرات سے مسلمانوں کو محروم رکھا، لیکن آج سے سو سال پہلے کے ماحول میں جو انسان طوفان کے سامنے کھڑا ہے، وہ اس کو نظر آ رہا ہے اور اس کے اثرات وثمرات اس کے سامنے ہیں، وہ ایک فیصلہ کر لے اور اس فیصلے کے نتیجے میں بعض منفی اور بیشتر مثبت سامنے چیزیں آئیں، تو آج ہم یہ کہنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ فیصلہ کرنے والے کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ ویسے بھی 'لغو' سے حضور نے منع فرمایا ہے۔ ماضی میں جس نے کوئی فیصلہ کیا، اس نے اس کی ذمہ داری بھی لی۔ بعض لوگوں نے ایک فیصلہ کیا تو بعض نے دوسرا۔ دونوں کے ثمرات ونتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نتائج پر تو بات کر سکتے ہیں، لیکن ماضی کو مستقبل کی طرف سے مشورہ دینا کہ ان کو کیا کرنا چاہیے تھا، یہ ایک غیر ضروری مشورہ ہے جس کا کوئی نتیجہ مستقبل میں نکلنے والا نہیں۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ جن حضرات نے سو سال پہلے امت مسلمہ کو مغرب کے

اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ جذبہ اور رویہ کمزور پڑ گیا ہے اور مغرب کے اثرات کے لیے مسلمانوں کے ہر گھر کے دروازے اور ہر کمرے کی کھڑکیاں اس طرح کھلی ہیں کہ اس میں مغرب کے کسی اچھے یا برے اثر کو آنے سے آپ نہیں روک سکتے۔ ہمارے ہاں بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو ہمیں اپنے اندر آنے کا موقع دینا چاہیے اور اس کے منفی اثرات کا راستہ روکنا چاہیے۔ یقیناً یہ درست رویہ ہے اور ہر مسلمان اس سے اتفاق کرے گا۔ یہ 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا اصول ہے جس سے مسلمانوں نے ہمیشہ اتفاق کیا اور جو مسلمانوں کی فکری اور علمی تاریخ کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے، لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ کیا مغرب کا ایجنڈا بھی یہی ہے کہ ہم 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر عمل کریں۔ جو چیز ہمارے لیے قابل قبول ہو، وہ ہمارے سامنے پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دیں اور جو چیز ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو، اس کو واپس اپنی الماری میں رکھ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اپنا پورا ایجنڈا یہاں لانا چاہتا ہے اور انھوں نے ہم سے زیادہ اس پر غور کیا ہے کہ ان کی تہذیب کا جو پورا پیکج ہے، اس کی کون سی چیزیں ہماری تہذیب کے لیے مفید ہیں اور کیا چیزیں اس پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہیں۔ اس پر باقاعدہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور صرف عام سطح پر نہیں بلکہ بڑی سے بڑی اور اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر اس پر غور وخوض ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ نے سابق امریکی صدر نکسن کی کتاب 'Seize the Moment' پڑھی ہو تو اس میں اس نے پوری تفصیل سے یہ بات بیان کی ہے کہ دنیاے اسلام میں مغربی اثرات کا نفوذ کس حد تک ہے اور کس طرح ہونا چاہیے۔ یہ بات نہ صرف نکسن نے لکھی ہے، بلکہ ان کے صف اول کے تمام دانش ور، مفکرین اور مدبرین یہ بات لکھ رہے ہیں۔

آج سے چند سال پہلے مجھے جرمنی میں ایک اجتماع میں جانے کا موقع ملا جس میں مختلف ممالک کے دانش ور اور مفکرین مدعو کیے گئے تھے جن میں واحد مسلمان شریک میں تھا۔ میرے علاوہ باقی لوگ مغربی یورپ اور خاص طور پر وسطی یورپ سے بلائے گئے تھے۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: ?Is Islam a threat to West and Europe (کیا اسلام مغرب اور یورپ

کے لیے ایک خطرہ ہے؟) اس میں انھوں نے مجھے بلایا تھا کہ اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ یہ کوئی ایک ہفتہ کی نشست تھی جس میں انھوں نے چودہ آدمیوں کو دعوت دی تھی۔ ایک دن میں دو آدمیوں کی گفتگو ہوتی تھی جس میں ہر شخص تفصیل سے اپنے خیالات حاضرین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اس میں ایک دن مجھے بھی گفتگو کرنے کا موقع ملا جس میں یہ سوال سامنے آیا کہ دنیاے اسلام میں مغربی اثرات کے حوالے سے کیا رویہ رہا ہے؟ اس کے جواب میں، میں نے کہا کہ عالم اسلام میں جب سے مغربی اثرات آئے ہیں، جس کو کم وبیش دوسو سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں دنیاے اسلام نے تین رویے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے دو رویے تو بتدریج کمزور ہو رہے ہیں یا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کمزور ہو رہے ہیں، اور تیسرا رویہ بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پچھلے پچاس سو سالوں میں قوت پیدا ہوئی ہے۔

ایک رویہ جو سمٹ رہا ہے اور سمٹتے سمٹتے یقیناً ختم ہونے کے قریب ہے، وہ ہے جس کی مثال میں نے لال بینگن اور ٹماٹر کے حوالے سے دی۔ اب شاید دنیاے اسلام میں اس طرح کی مزاحمت کرنے والے لوگ موجود نہیں بلکہ اس طرح کی مزاحمت کی افادیت کے قائل بھی میں سمجھتا ہوں کہ نہیں رہے۔ اگر ہیں تو بہت تھوڑے لوگ ہیں جن کا کوئی قابل ذکر اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ یہ وہ رویہ تھا جو ابتدا میں بہت مضبوط تھا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتا گیا۔

دوسرا رویہ جو شروع میں بہت قوت سے سامنے آتا محسوس ہوتا تھا، مسلمانوں کی اکثریت نے اس سے بھی زیادہ اتفاق نہیں کیا اور یہ رویہ بھی کمزور ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ جانے کا رویہ ہے جس نے یہ سمجھا کہ مسلمان اگر مغرب کے ساتھ سو فیصد ہم آہنگی کر لیں تو شاید ان کے تمام مسائل حل اور تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اس رویے کے ترجمان ۱۹ ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں دانشوروں میں بھی، سیاسی لیڈروں میں بھی اور عام سطح پر بھی کثرت سے پائے جاتے تھے، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ رویہ بھی کمزور ہو رہا ہے۔

تیسرا رویہ جو آغاز میں بہت کمزور اور تقریباً برائے نام تھا، اب دنیاے اسلام میں اس نے

اپنی جگہ بنا لی ہے اور مسلمان مفکرین اور دانش وروں کی ایک بڑی تعداد اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہی 'خذ ما صفا و دع ما کدر' کا رویہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں سے مسلمانوں کو استفادہ کرنا چاہیے، ان کی سائنس، ان کی ٹیکنالوجی، ان کی سہولتیں، یہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہونے چاہییں اور ان کو اپنانا چاہیے، جبکہ ان کے جو منفی پہلو ہیں، مثلاً اخلاقی اقدار کے متعلق ان کے خیالات ونظریات، یا سیکولرازم اور لا مذہبیت، یا مرد وزن کی آزادی کا تصور جو ان کے ہاں ہے، یہ چیزیں دنیائے اسلام کو قبول نہیں کرنی چاہییں۔ یہ رویہ پہلے بہت محدود تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور آج دنیائے اسلام کی ایک بڑی تعداد اس رویے پر قائم محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۹۲ء، ۱۹۹۳ء میں مذکورہ اجتماع میں جب میں نے ایک سوال کے جواب میں مذکورہ تجزیہ تفصیل سے بیان کیا تو اس کے جواب میں اجتماع کے شرکا نے، جن میں فرانسیسی نمائندے بھی شامل تھے، جرمن بھی شامل تھے اور آسٹریلیا کے لوگ بھی تھے، تقریباً بالاتفاق مجھے controvert کیا اور کہا کہ ٹھیک ہے، آپ اس رویے کو درست سمجھتے ہوں گے لیکن مغرب ان شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور اپنی تہذیب وتمدن سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت پہلی مرتبہ یہ پہلو میرے سامنے آیا۔ اس سے پہلے میرا ذہن اس طرف متوجہ نہیں تھا کہ آیا مغرب بھی اس بات پر تیار ہے یا نہیں کہ آپ کی شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور تہذیب سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دے۔ کم از کم اس اجتماع کے شرکا کا جواب بالاتفاق یہی تھا کہ مغرب آپ کو اس کی اجازت نہیں دے گا۔ یہ ایک پورا پیکج ہے جس کو آپ کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے گا اور اس میں وہ آپ کو اخذ وانتخاب (pick and choose) کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ یہ دانش ور اور مفکرین شاید اپنی main stream کی ترجمانی نہیں کر رہے، اور مغربی تہذیب میں جو فیصلہ کن قوتیں ہیں، ان کی زبان نہیں بول رہے۔ جیسے ہر شخص اپنی تہذیب کے بارے میں ایک عصبیت کا رویہ رکھتا ہے، یہ بھی اپنی تہذیب کے بارے میں ایک عصبیت اور حمیت رکھتے ہیں اور اس عصبیت کی وجہ سے یہ بات ان کو

پسند نہیں آئی کہ ہم ان کی تہذیب کے بعض پہلوؤں کو منفی قرار دے کر مسترد کرنا چاہتے ہیں۔ ایک کمزور اور غریب فقیر آدمی کسی دولت مند آدمی سے یہ کہے کہ آپ کی کوٹھی یا محل میں فلاں فلاں چیزیں مجھے غلط معلوم ہوتی ہیں اور میں انھیں مسترد کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ اسے اچھا نہیں لگے گا اور وہ اس کو بے وقوف سمجھے گا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ شاید وہ اس نفسیاتی کیفیت میں میری بات کی تردید کر رہے ہیں، لیکن پچھلے بارہ پندرہ سالوں میں مغرب کے بہت سے لوگوں سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور اب مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ ان کی طے شدہ پالیسی ہے جو انھوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کی ہے کہ دنیاے اسلام اپنے آپ کو مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے اور مکمل طور پر مغربی ایجنڈے کو اختیار کرے، اور اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو مغربی تہذیب کے فوائد یا مثبت اثرات سے مسلمانوں کو متمتع ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ بات جو ۱۹۹۳ء سے پہلے میرے علم میں نہیں تھی، اب وقت کے ساتھ ساتھ روز روشن کی طرح یوں واضح ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پوری دنیاے مغرب کا ایک طے شدہ فیصلہ ہے کہ پوری دنیاے اسلام پر مغرب کے ایجنڈے کو سو فی صد مسلط کر دیا جائے۔

مغرب کے ایجنڈا ایک ہمہ گیر ایجنڈا ہے اور اس میں ہر چیز شامل ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو بہت سے کام ہو رہے ہیں، وہ محض اتفاق سے یا مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں میں کمزوریاں بھی ہیں اور ان کی دینی حمیت میں کمی بھی آئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ بالا دست قوتیں بھی ہیں جو طے شدہ پروگرام کے تحت آگے بڑھ رہی ہیں اور دنیاے اسلام کو ایک خاص رخ پر چلانا چاہتی ہیں۔ اب مسلمان کس حد تک اس میں ساتھ جانے کو تیار ہیں، مسلمان دانش ور جو سمجھتے ہیں کہ مغرب کی مثبت چیزوں سے اتفاق کریں اور منفی چیزوں کو مسترد کر دیں، وہ کس حد تک اس میں کام یاب ہوں گے، اور مستقبل کیا خبر لائے گا، یہ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے، لیکن اس رویے کی کامیابی کا سارا دار ومدار مسلمانوں کے فہم صحیح پر، مسلمانوں کی بصیرت اور ان کے عزم وارادے پر ہے، اور اس کے لیے جو چیز سب سے پہلے درکار ہے، وہ خود دنیاے اسلام میں اسلامی تہذیب، اسلامی علوم وفنون اور معارف اسلامی سے گہری اور

ماہرانہ واقفیت ہے۔ جب تک شریعت اور شریعت کے پیغام اور تعلیم میں یہ گہری بصیرت اور ماہرانہ واقفیت پیدا نہیں ہوگی، اس وقت تک کوئی ایسی بنیاد فراہم نہیں ہوسکتی جس پر آگے چل کر عمارت کھڑی کی جا سکے۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیائے اسلام میں علوم وفنون کی اساس قرآن مجید تھا۔ قرآن مجید وہ جڑ فراہم کرتا تھا جس سے علوم وفنون کا گلشن پیدا ہوا۔ یہی وہ درخت تھا جس کے برگ وبار اور ثمرات مسلمانوں کے بقیہ علوم وفنون کی صورت میں سامنے آئے۔ آج سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے قاضی ابوبکر بن العربی نے، جو ایک مشہور مفسر اور مالکی فقیہ ہیں، کہیں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے جملہ علوم وفنون کی تعداد سات سو ہے۔ ان سات سو علوم وفنون کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ سنت سے اور یہ سب کے سب سنت کی شرح ہیں، اور سنت رسول قرآن مجید کی تشریح وتفسیر ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی حیثیت اس بنیاد اور جڑ کی ہے جس پر مسلمانوں کی ساری تعلیمی، فکری اور تہذیبی سرگرمی کا دارومدار ہے۔ یہ کیفیت کم وبیش گیارہ، بارہ سو سال رہی اور ایک ایسے نظام تعلیم نے جس کی اساس قرآن مجید، سنت رسول اور ان دونوں سے پیدا ہونے والے علوم وفنون پر تھی، امت مسلمہ کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ امت مسلمہ میں بڑی بڑی ریاستیں بھی قائم ہوئیں، بڑی بڑی تہذیبیں سامنے آئیں، اور یورپ کے کم وبیش آدھے حصے پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مسلمانوں کی فوجیں آسٹریلیا کے حدود تک پہنچیں اور مشرقی اور جنوبی یورپ میں مسلمانوں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اسپین میں آج بھی مسلمانوں کی سات سو سالہ حکومت کے آثار موجود ہیں۔ جہاں بانی کے اس پورے سلسلے میں اسلامی علوم وفنون اور وحدت پر مبنی نظام تعلیم نے مسلمانوں کے خالص دینی تقاضے بھی پورے کیے اور خالص دنیوی تقاضے بھی۔ یہ تاثر کہ دینی اور دنیوی علوم جدا جدا ہیں، اسلامی تاثر نہیں، بلکہ یہ مغرب کا تحفہ اور مغربی سیکولرازم کے باقیات واثرات میں سے ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں اور میں بغیر کسی تردد کے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جب تک یہ دو نظام الگ الگ رہیں گے، دنیائے اسلام میں سیکولرازم کو فروغ ملتا رہے گا۔ سیکولرازم کیا ہے؟ سیکولرازم یہ ہے کہ جو چیز مذہبی ہے، وہ مذہبی دائرے میں رہے اور جو

غیر مذہبی ہے، وہ غیر مذہبی دائرے میں رہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی اتفاق پیدا نہ ہو۔ یہ دونوں ایک نہر یا ایک دریا کے دو کنارے ہیں جو کبھی آپس میں نہیں ملتے اور ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہتے ہیں۔ زندگی کو دو متوازی نظاموں اور دو متوازی حصوں میں تقسیم کرنا، اسی کو سیکولرازم کہتے ہیں۔ یہی لا مذہبیت اور لا دینیت ہے۔ لا دینیت کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔

انگریز کے زمانے میں جب main stream کی قیادت مسلمانوں سے چھن گئی تو اس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے تحفظ کے لیے ایک خالص دینی نظام تعلیم کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی اور امت مسلمہ میں مذہب کی باقیات کو بچانے کا واحد طریقہ تھا کہ مذہبی تعلیم کے نام پر جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ کیا جائے اور جس حد تک مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، رکھا جائے۔ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں تھا کہ دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نظام موجود رہے ہوں۔ چنانچہ مغلیہ دور میں جس درس گاہ نے، جس نظام تعلیم اور نصاب تعلیم نے مجدد الف ثانی جیسا شخص پیدا کیا، جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کا یہ جملہ ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ The greatest religious genius produced by Muslim India، (مسلم ہندوستان نے سب سے بڑا جو مذہبی عبقری پیدا کیا، وہ شیخ احمد سرہندی تھے)، اسی نظام میں نواب سعد اللہ خان بھی تیار ہوا تھا جو مجدد صاحب کا کلاس فیلو تھا اور جو سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا۔ وہ سلطنت مغلیہ جو موجودہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، سکم، برما، ان سب ریاستوں پر مشتمل تھی۔ اس کے نظام کو اس نے شاہ جہان کے زمانے میں کامیابی سے چلایا تھا۔ پھر استاد احمد معمار جس نے تاج محل بنایا، یہ بھی مجدد صاحب کا کلاس فیلو تھا۔ یہ تینوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے اور ایک ہی درس گاہ کے پڑھے ہوئے تھے۔ اب دیکھیے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیا کی متمدن ترین سلطنت کو اس کے کامیاب ترین ادوار میں قیادت فراہم کی اور اس کا نظام چلا کر دکھایا، دوسرا وہ شخص جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا مذہبی عبقری ہے، جس کی عظمت کو بیان کرنا دشوار ہے اور جس نے برصغیر کی دینی تحریکات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بعد کی کوئی دینی تحریک

اور کوئی دینی سرگرمی اس کے اثر اور شخصیت کے احترام سے خالی نہیں ہے، اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ بنایا، یہ تینوں افراد یہ ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے اور ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ یہی اسلام کا آئیڈیل اور یہی اسلام کا معیار ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ہم اس پر از سرنو غور کرتے، لیکن یہ کام نہ حکومتوں نے کیا اور نہ اہل علم نے اس پر ابھی تک کوئی توجہ دی ہے، لیکن اس پر جتنی جلدی غور ہو جائے، اچھا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام پوری امت مسلمہ کی تاریخ کے ایک مرحلہ کی تشکیل نو کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نئے دور کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے اور میں اس کو اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھتا ہوں جتنی اہمیت دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تھی۔ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا اور اسے غیر اہم نہیں سمجھتا۔ برصغیر اور پورے جنوبی ایشیا میں پچھلے دوسو سال کی پوری مذہبی تاریخ دار العلوم دیوبند اور اس کے موسسین کی مرہون منت ہے، لیکن یہ کام جس کا آغاز مولانا زاہد الراشدی اور ان کے ہم خیال اہل علم نے کیا ہے یا کر رہے ہیں، اگر یہ نتیجہ خیز ثابت ہو تو اس کے اثرات اس سے کہیں زیادہ دیرپا اور دوررس ہوں گے، اس لیے کہ یہ اس روایت کا احیا کرنے کے مترادف ہے جو اصل اسلامی روایت ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی کاوش یا مہم ایک بدلی ہوئی صورت حال میں دفاعی اور وقتی کوشش تھی۔ وہ آئیڈیل صورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ آئیڈیل حالات تھے۔ نہ وسائل دست یاب تھے، نہ حکومتی سرپرستی دست یاب تھی، اور نہ وہاں کے فارغ شدہ حضرات کے لیے قیادت کے مناصب موجود تھے۔ معاشرہ ان کی قیادت کو ماننے اور ان سے رہنمائی لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ان کی رہنمائی مسجد اور مدرسے کے خاص دائرے تک محدود تھی۔ اس کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا، اللہ تعالیٰ ان کو جزاے خیر دے گا اور جتنا دین موجود ہے، انھی کی کاوش سے موجود ہے۔ لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو دین موجود ہے، اس کو زندگی کے روز مرہ معاملات سے Relate کیا جائے اور اس کو معاشرے میں فعال قائدانہ کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اہل دین کے پاس دینی علوم کا تخصص بھی موجود ہو اور جس دنیا اور جس معاشرے میں انھیں قیادت فراہم کرنی ہے، اس کے بارے میں

بھی قائدانہ اور ناقدانہ واقفیت انھیں حاصل ہو۔

جب میں یہ بات عرض کرتا ہوں تو بعض علماء کرام یہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے انھوں نے اس کا اظہار فرمایا کہ میں اس بات کا داعی ہوں کہ دینی مدارس کو میڈیکل کالجز میں Convert کر دیا جائے یا انھیں انجینئرنگ کے ادارے بنا دیا جائے۔ ایک بڑے محترم اور بزرگ عالم نے مجھ سے غصے سے پوچھا کہ کیا انجینئرنگ کالج میں مولوی تیار ہوتے ہیں؟ نہیں تو پھر دینی مدارس میں انجینئر کیوں تیار ہوں؟ لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے، اس لیے کہ نہ انجینئر تیار کرنا مقصد ہے اور نہ میڈیکل ڈاکٹر تیار کرنا بلکہ علماء کرام ہی تیار کرنا مقصد ہے، لیکن نواب سعد اللہ کی طرح کے علما۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر دور کا ایک محاورہ اور ایک زبان ہوتی ہے۔ قرآن مجید اور سنت تو ایسی چیز ہیں جو ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کا محاورہ ہر دور کے لیے ہے اور ہر دور کے لیے رہے گا۔ ان کے محاورے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ ہمیشہ وہی رہے گا، اور ان کو ہمیشہ انھی کے محاورے اور انھی کی اصطلاح میں سمجھا جائے گا، لیکن فقہاء کرام، شارحین حدیث اور مفسرین نے شریعت کے نصوص کو اپنے اپنے زمانے سے Relate کیا اور اپنے زمانے کے محاورے میں اس کی تعلیم کو مرتب کیا ہے۔ یہ محاورہ حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ ماضی میں بھی بدلتا رہا ہے اور آئندہ بھی بدلتا رہے گا۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ وہ علماء کرام جن کے پاس ٹھوس دینی علوم موجود ہیں، جن کے پاس پاور ہاؤس اور اس میں قوت کا ذخیرہ موجود ہے، چونکہ ان کا محاورہ آج کے محاورے سے مختلف ہے، اس لیے دور جدید کا آدمی ان کے علم سے استفادہ نہیں کرتا۔ آج سے کم وبیش ۲۵ سال پہلے وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی۔ جسٹس صلاح الدین مرحوم اس کے پہلے چیف جسٹس تھے۔ بہت نفیس انسان تھے۔ میرے مشورے سے انھوں نے بعض علماء کرام کو وفاقی شرعی عدالت کا مشیر مقرر کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ جن حضرات کو آپ نے مشیر مقرر کیا ہے، جن کی تعداد ۳۰، ۳۵ کے قریب تھی، ان سب کو آپ کھانے کی دعوت دیں۔ چنانچہ انھوں نے پورے پاکستان سے ان جید علماء کرام کو کھانے کی دعوت دی۔ ایک بزرگ جو بہت ٹھوس عالم تھے، انتہائی گہرا علم رکھتے تھے، وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ

گئے۔ چیف جسٹس صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت! Islamic State کی Minimum requirement کیا ہے؟ بالکل یہی الفاظ تھے، یعنی کسی ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ اس کا وہ کوئی جواب نہیں دے پائے۔ شاید سمجھے نہ ہوں۔ جسٹس صاحب نے دوبارہ اردو میں پوچھا تو وہ پھر بھی اس کا کوئی صحیح جواب نہیں دے پائے۔ میں تھوڑے فاصلے پر تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ صف اول کے عالم ہیں، اگر ان کے اس سوال کا جواب نہ دے سکے تو ہوسکتا ہے کہ علما کے بارے میں ایک منفی تاثر جسٹس صاحب کے دل میں بیٹھ جائے۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ شاید چیف جسٹس صاحب یہ پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ 'دارالاسلام' کی تعریف کیا ہے؟ اب انھوں نے فوراً جواب دیا اور بڑے مدلل انداز میں جواب دے کر چیف جسٹس کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس وقت یہ بات مجھ پر واضح ہوئی کہ علماء کرام کے پاس علم تو ہے، لیکن محاورہ نہیں۔

محاورہ ہر زمانے کا مختلف ہوتا ہے اور ہر زمانے کے علوم سے متاثر ہوتا ہے۔ جس زمانے میں منطق نہیں آئی تھی، آپ اس زمانے کی اصول فقہ کی کتابیں دیکھیں کہ ان کا انداز کیا تھا؟ امام شافعی کی کتاب 'الرسالہ' پڑھیں۔ اس کے بعد آپ خود شافعی فقیہ امام غزالی کی 'المستصفی' پڑھیں۔ دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسرار حدیث پر کتاب لکھی ہے۔ اسرار حدیث پر 'معالم السنۃ' میں امام خطابیؒ نے بھی لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ آپ ان دونوں کتابوں کو پڑھیں تو دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ شاہ ولی اللہ کا محاورہ سارے کا سارا یونانی فلسفے پر مبنی ہے اور یونانی فلسفہ جیسا کہ برصغیر میں پڑھایا جاتا تھا، میبذی اور شرح ہدایۃ الحکمۃ اور فلسفہ کے بارے میں جو جو کتابیں اس وقت رائج تھیں، ان سب کے اثرات اور مصطلحات شاہ صاحب کی 'حجۃ اللہ البالغۃ' میں موجود ہیں۔ اب خالص علم حدیث ہے اور شاہ صاحب علم اسرار حدیث پر بات فرما رہے ہیں، لیکن منطق اور فلسفے کے محاورے میں۔ جو بات خطابی نے کی ہے، وہی بات شاہ صاحب کہہ رہے ہیں اور اسی کو آگے بڑھا رہے ہیں، لیکن اگر خطابی ہوتے تو شاید ایک لفظ نہ سمجھتے کہ شاہ صاحب کیا

کہہ رہے ہیں، جیسا کہ چیف جسٹس صاحب کی بات وہ بزرگ عالم نہیں سمجھ پائے۔

اگر آپ کے پاس ریڈیو سیٹ تو ہو، لیکن ریڈیو اسٹیشن سے جس فریکونسی پر پیغام نشر ہو رہا ہے، آپ کا ریڈیو سیٹ اس فریکونسی پر کام نہ کرتا ہو تو آپ کے لیے وہ بے کار ہے۔ جب تک آپ اپنے ریڈیو سیٹ کو مطلوبہ فریکونسی پر نہیں لائیں گے، آپ ریڈیو اسٹیشن کی نشریات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ ضروری ہے کہ علماءکرام کے پاس جو علم دین کا پاور ہاؤس ہے، اور ایک عام آدمی جو دین کی راہنمائی چاہتا ہے اور جس کو آپ راہنمائی دینا چاہتے ہیں، ان دونوں کی فریکونسی ایک ہو۔ اس فریکونسی کو موافق بنانے کے لیے ایک تو تخصص ضروری ہے جس پر میں ابھی مزید بات کروں گا، اور دوسرا دور جدید کا محاورہ درکار ہے۔ یہ خلط مبحث اور غلط فہمی ہے کہ علما کو انجینئر یا ڈاکٹر بنانا مقصود ہے۔ نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ علوم وفنون جنھوں نے آج کل کی تہذیب کی تشکیل کر رکھی ہے اور جن کی بنیاد پر آج ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے، حتیٰ کہ پاکستان، سعودی عرب اور ایران میں بھی چل رہا ہے، ان سے علما بھی مناسب طور پر واقف اور مانوس ہوں۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں علوم وفنون کی ایک الگ تقسیم کی تھی۔ کچھ علوم مقاصد یا علوم حقیقی ہیں اور کچھ علوم وسائل یا علوم آلیہ ہیں۔ اسی طرح کچھ علوم ہیں، کچھ صنائع ہیں اور کچھ فنون ہیں۔ یہ مسلمانوں کی تقسیم تھی۔ آج عملاً یہ تقسیم موجود نہیں ہے۔ آج تعلیم کا نظام عملاً اس تقسیم پر نہیں چل رہا۔ آج دنیا میں ایک نئے انداز سے علوم کی مختلف تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک اہم تقسیم علوم عمرانی (Social sciences) اور علوم انسانی (Humanities) کی ہے۔ سوشل سائنسز میں وہ ان علوم وفنون کو شامل کرتے ہیں جو انسانی معاشرے کی تشکیل اور معاشرتی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور کسی حد تک قانون شامل ہیں۔ یہ عمرانی علوم ہیں جن سے اجتماعی رویوں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ Humanities وہ علوم ہیں جو انسان کے مطالعے پر مبنی ہیں، یعنی فرد کے خیالات، فرد کے افکار، فرد کی نفسیات، فرد کے احساسات وجذبات، یہ سب کے سب ہیومینٹیز کہلاتے ہیں۔ اس میں فلسفہ، نفسیات اور بشریات شامل ہیں۔ یہ دو میدان وہ ہیں جن سے دور جدید میں تہذیب کی تشکیل ہوئی ہے۔ آج ہمارا ایک

پڑھا لکھا انسان، چاہے وہ پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا مصر کا یا کسی بھی اسلامی ملک کا، جب وہ بات کرتا ہے تو اسلامی علوم اور تصورات کے تناظر (perspective) میں بات نہیں کرتا۔ وہ اسلامی اصطلاحات یا فقہی سیاق وسباق یا فقہی محاورے میں بات نہیں کرتا، بلکہ وہ مغربی سوشل سائنسز کے محاورے میں بات کرتا ہے۔ عمرانی علوم اور انسانی علوم کے کے علاوہ مختلف قسم کے طبیعی علوم بھی ہیں جن کی حیثیت Tools اور آلات کی ہے جن سے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ ان کا دینی علوم سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بنتا۔ بالواسطہ جس چیز کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ یہ ہے کہ علماء کرام بقدر ضرورت سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح کی واقفیت رکھتے ہوں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے منطق سے واقفیت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اگر آپ اس دور یعنی تیسری صدی کے مباحث پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ جب یونانی منطق اور فلسفہ کی کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں، تو مسلمانوں میں اسی طرح کے تین رویے تھے جو آج مغربی تہذیب کے بارے میں ہیں۔ علماء کرام، محدثین اور مفسرین کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ تھا جو ان سب چیزوں کو ناپاک اور گردن زدنی سمجھتا تھا، جو یونانی منطق اور فلسفہ سے اعتنا رکھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج یا اس کی حدود پر سمجھتا تھا، ان کو مسلمانوں کا نمائندہ نہیں سمجھتا تھا۔ یہ بحثیں موجود تھیں کہ منطق کی کتابوں سے استنجا جائز ہے یا نہیں۔ یہ جزئیات آپ کو فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، یعنی یہاں تک ناپسندیدگی اور نفرت کی کیفیت تھی۔ یہ شعر آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ

وا عجبا لمنطق اليونان

كم فيه من افك ومن بهتان

مخبط لجيد الاذهان

ایک لمبی نظم ہے، پتہ نہیں کس بزرگ کی ہے۔ تو منطق کے بارے میں یہ کیفیت تھی۔ اس کے بعد یہ رویہ محدود ہوتا گیا، جیسا وہ ٹماٹر والا رویہ محدود ہو گیا۔ پھر یہ کیفیت آئی کہ خالص اسلامی علوم میں منطق وفلسفہ آ گیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی 'حجۃ اللہ البالغۃ' علم اسرار حدیث پر بہترین کتاب ہے۔ میری دانست اور رائے میں اس سے بہتر اسلامی علوم کی نمائندہ کتاب برصغیر میں

نہیں لکھی گئی اور میں شاہ صاحب کو برصغیر میں مسلمانوں کا امیر المومنین فی الحدیث سمجھتا ہوں۔ لیکن جب تک آپ منطق اور فلسفہ کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں، انھی یونانیوں کی منطق جو بت پرست اور مشرک تھے، بدکار تھے، اخلاقی اعتبار سے بھی کچھ اونچے لوگ نہ تھے، تو ان کی کتابوں کو سمجھے اور ان کے افکار کو جانے بغیر آپ علم اسرار حدیث پر اسلامی لٹریچر کی بہترین کتاب نہیں سمجھ سکتے۔ شاہ ولی اللہ تو بعد کے ہیں۔ امام غزالی جیسے حجۃ الاسلام کی کتاب 'المستصفیٰ'، جو اصول فقہ جیسے خالص اسلامی علم پر ہے، اگر آپ منطق میں اچھی بصیرت نہیں رکھتے تو اس کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں منطق اتنی گھسی ہوئی ہے کہ اگر 'المستصفیٰ' کو سمجھ کر پڑھ لیں تو منطق بھی آپ کو آ جائے گی۔ انھوں نے منطق کو اس کتاب میں اتنا سمو دیا ہے۔ امام شاطبی کی کتاب 'الموافقات' آپ نے پڑھی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اصول فقہ پر انسانی تاریخ کی بہترین کتاب ہے۔ انسانی تاریخ میں اصول قانون پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ لیکن جب تک آپ منطق وفلسفہ نہ جانتے ہوں، اس کتاب کے مضامین کو بھی نہیں سمجھ سکتے حالانکہ وہ ایسے علاقے، شمالی افریقہ اور اسپین وغیرہ میں لکھی گئی جہاں منطق وفلسفہ کا رواج کم تھا۔ لیکن اس کے باوجود ساری کتاب کی اٹھان، اس کا استدلال، اس کی ترتیب، اس کا اسلوب اس دور کے عقلیات کے معیارات کے مطابق خالص عقلی ہے۔

یہ ایک ایسی تہذیب یا ایک ایسے علاقے کی نمائندہ تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ تھا جس سے مسلمانوں کو کوئی خطرہ نہیں تھا، نہ سیاسی طور پر ان کی مسلمانوں کے ساتھ کوئی کشمکش تھی، نہ عسکری طور پر وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے، نہ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اگر مسلمان ان کے نقطہ نظر کا مطالعہ نہ کریں تو وہ اسے زبردستی مسلط کر دیں۔ یہ تو مسلمانوں نے خود ہی ان کے علوم وفنون کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اگر یونانیوں کے علوم وفنون جو نہ مسلمانوں پر حاکم تھے، نہ بالادست تھے، نہ ان کے پاس اقتدار تھا، نہ وہ مسلمانوں کے لیے خطرہ تھے، مسلمانوں نے محض علمی دلچسپی کی خاطر انھیں اختیار کیا اور ان سے استفادہ کیا تو وہ علوم وفنون جو ایک بالادست طاقت نے آپ پر مسلط کر دیے ہیں اور جن کے تصورات اور اسلوب استدلال

کے مضر اثرات مسلمانوں میں داخل ہو رہے ہیں، انھیں سیکھنا اور ان سے واقفیت پیدا کرنا کیونکر مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ہے؟ آج اس کی ضرورت اس سے کئی ہزار گنا بلکہ کئی لاکھ گنا زیادہ ہے جتنی ضرورت یونانی علوم وفنون کے مطالعے کی تھی۔

یہ ٹھیک ہے کہ یونانی منطق اور فلسفہ سے اشتغال رکھنے والے بہت سے لوگوں نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جو اسلام کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ آپ فارابی کی کوئی کتاب پڑھیں، مثلاً اس کی کتاب ہے 'آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ' جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم سیاسی فکر کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلامی تعلیم وعقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ایک اعتبار سے وہ بڑی غیر معمولی کتاب ہے کہ اس نے یونانی علوم وفنون پڑھے اور ارسطو کی Politica یعنی 'سیاسیات' کا ترجمہ اس نے پڑھا، شاید افلاطون کی Republic کا بھی ترجمہ دیکھا ہو، لیکن بظاہر اس کے شواہد کم ہیں۔ سیاسیات پر وہ ارسطو کے نقطہ نظر سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے ایک کتاب لکھی اور کوشش کی کہ ان خیالات کو اسلام سے ہم آہنگ کر کے بیان کرے۔ میرے خیال میں یہ Islamization of Knowledge کی پہلی کوشش تھی۔ یہ داعیہ اس کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ وہ یونانیوں کے خیالات کو اسلام کے مطابق بنائے؟ اس کے دل میں کوئی اسلامی حمیت تھی اور کوئی اسلامی جذبہ تھا تو پیدا ہوا۔ اس اسلامی جذبے نے اس کو ارسطو کے خیالات کو جوں کا توں مسلمانوں میں پیش کرنے سے باز رکھا اور اس حد تک اس کا اسلامی فہم قابل ستائش ہے۔ اس کے مطابق اس نے ایک ایسی چیز کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر لوگوں کی رہنما بنی۔ اس نے اسلام کی سیاسی فکر اور اس کے دستوری تصورات کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ نقل کے معیار کے ساتھ ساتھ عقل کے معیار پر بھی پورا اترے۔ اسی وجہ سے میں ابن سینا اور فارابی کا بڑا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، اس کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے متعارض ہیں۔

آج بھی اسی بات کی ضرورت ہے کہ وہ حضرات جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں یا ارادہ اور خواہش رکھتے ہوں کہ آگے چل امت مسلمہ کی فکری قیادت کی ذمہ داری انجام دیں، ان کو بقدر

ضرورت مغربی علوم سے ناقدانہ اور قائدانہ واقفیت ہونی چاہیے۔ ان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مثلاً وہ اصول قانون کے اس طرح عالم ہوں جس طرح کوئی ماہر مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اگر ہونا چاہتا ہے تو ضرور ہو جائے، لیکن اتنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ اصول قانون جیسا کہ مغرب میں ہے، اس کے بنیادی تصورت، اس کے بنیادی عقائد، اس کے بنیادی concerns and issues جس سے وہ بحث کرتا ہے، وہ کیا ہیں، کیوں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے جو basic issues ہیں، وہ گرفت میں آ جائیں۔ اس کے بعد ان پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر ایک صاحب علم فقیہ یہ دیکھے کہ اس میں کیا چیز ہے جو کمزور ہے، کیا چیز ہے جو مضبوط عقلی بنیادوں پر قائم ہے، اور کیا چیز یا کیا اسلوب استدلال ہے جس سے کام لے کر اصول فقہ کے اس تصور یا نظریہ کو زیادہ بہتر انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ ناقدانہ انداز ہے۔

آپ دیکھیں کہ اصول فقہ کو جس طرح امام شافعی نے مرتب فرمایا تھا اور جس طرح امام سرخسیؒ نے اس پر 'اصول السرخسی' لکھی تھی جو فقہ حنفی میں پہلی کتاب ہے، اس انداز کی کتابیں بعد میں نہیں لکھی گئیں۔ امام رازی اور امام غزالی کی کتابیں اس انداز کی نہیں ہے۔ ان میں منطق اور فلسفہ آ گیا ہے جو جائز تھا۔ امام غزالی نے اصول فقہ کے ہر مسئلہ کو منطق کے دلائل سے اس طرح ثابت کر کے دکھایا کہ یونانی فلسفہ و منطق کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر امام غزالی کے استدلال سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس طرح انھوں نے اصول فقہ کو یونانی منطق کے ماہرین کے فہم کے قریب کیا۔ منطق سے متاثر لوگ اصول فقہ سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اصول فقہ کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا کہ یہ فن عقل و نقل دونوں کی میزان پر پورا اترتا ہے۔ یہی کام آج ہمیں کرنا پڑے گا۔ جب تک نہیں کریں گے تو بات آگے نہیں بڑھے گی۔

اسی طرح آج جو سارا طبقہ ہمارا اور آپ کا نظام چلا رہا ہے، یہ اصول فقہ سے واقف نہیں۔ یہ انگریزی اصول قانون سے واقف ہیں۔ اینگلو سیکسن لا، اس کے تصورات و استدلالات اور عقائد، سب ان کے رگ و پے اور گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب یا تو آپ انھیں مجبور کریں کہ وہ اپنا سب کام چھوڑ کر اصول فقہ پڑھیں تو یہ عملاً ہوگا نہیں۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ اپنی

ملازمت، تدریس، نوکری چھوڑ کر پانچ سال یا دس سال اصول قانون پڑھنے پر لگائیں تو آپ تیار نہیں ہوں گے۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے، آپ کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ کے مشاغل اس کے متحمل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے مشاغل بھی اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر قدیم محاورے میں لکھے ہوئے اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل کریں۔ ایک وکیل اپنی وکالت کیوں چھوڑے؟ اگر چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور وہ کیوں پانچ سال اصول فقہ یا فقہ پڑھنے پر لگائے؟ پانچ سال میں بھی اتنی واقفیت پیدا نہیں ہوگی جتنی ہونی چاہیے۔ اس لیے مطالبے کرنے سے، جلوس نکالنے سے، بینر لگانے سے کوئی جج یا وکیل خود بخود فقہ کا ماہر نہیں ہو جائے گا۔ وہ تو تب بنے گا جب وہ پڑھے گا اور تب پڑھے گا جب آپ اسے پڑھانا چاہیں گے اور جب پڑھانا چاہیں گے تو اس کے لیے اس کے ذہنی پس منظر اور اس کے مزاج کے مطابق آپ کو تیاری کرنی پڑے گی۔ اس میں شارٹ کٹ کوئی نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ آج کوئی اسلامی تحریک یا دینی جماعت دھرنا دے دے اور کل اس کے نتیجے میں جتنے جج صاحبان اور وکلا ہیں، جن کی تعداد بالترتیب پانچ ہزار اور بارہ ہزار کے قریب ہے، سب کے سب فقہا ہو جائیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی صورت حال یہی رہے گی جو آج ہے۔ اس کے لیے بہت long term جانا پڑے گا۔ جب دو سو سال میں یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے تو کم از کم دو سو نہیں تو پچاس سال تو کام کرنا پڑے گا۔ پچاس سال کم از کم تبدیلی کے لیے درکار ہیں، اس وقت سے جب تبدیلی کے لیے کام شروع ہوگا۔ اگر پچاس سال پہلے شروع ہو چکا ہوتا تو آج تبدیلی آ چکی ہوتی۔ اس لیے اصول فقہ کو اس انداز سے مرتب کرنا پڑے گا کہ دور جدید کا انسان جو قانون تو جانتا ہے اور مغربی اصول قانون سے مانوس ہے، وہ اس تصور کو سمجھ سکے اور اس تصور کو اپنے فہم کے قریب لا سکے۔ مسلمانوں کو ان علوم میں اتنی واقفیت پیدا کرنی ہوگی کہ ان کے اسلوب استدلال کے ذریعے سے اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیم کو پیش کر سکیں، جس طرح امام غزالی نے منطق سے کام لے کر اصول فقہ کے اصولوں کو پیش کیا تھا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگ موجود ہوں۔

اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ جو لوگ اصول قانون کے ماہر ہوں، انھیں اصول

فقہ کا ماہر بھی بنا دیا جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ جو اصول فقہ کا ماہر ہو، اسے بقدر ضرورت اصول قانون کا ماہر بنا دیا جائے۔ دوسری صورت زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے۔ میں نے یہ ایک مثال صرف اصول قانون کی دی ہے۔ یہ مثال علم سیاسیات، سوشیالوجی اور دیگر علوم پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ ان علوم وفنون سے ایک ناقدانہ واقفیت درکار ہے، لیکن اس ناقدانہ واقفیت کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی علوم کا تخصص گہرا ہو، ورنہ مغربی علوم وفنون کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ یہ درست ہے اور یہ غلط ہے، یہ عقیدہ ٹھیک ہے، اسلام کے مطابق ہے اور یہ عقیدہ اسلام کے خلاف ہے، اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ ایک کچا آدمی ان کی گمراہیوں سے بھی متاثر ہو جائے گا جیسا کہ آج تک ہوتا رہا ہے۔ علماء کرام جو متامل ہیں، شاید اسی وجہ سے ہیں کہ ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ کچا علم رکھنے والوں نے مغربی علوم وفنون اپنائے اور اسلام کی وہ تعبیریں کیں جو اسلام کی روایت کے مطابق نہیں تھیں اور ان میں انھوں نے اسلام کی علمی روایت کے تسلسل کو محفوظ نہیں رکھا تھا۔ اس لیے جب تک علم میں پختگی نہ ہو، اس وقت تک ناقدانہ تصور نہیں پیدا ہو سکتا۔ پختگی پیدا کرنے کے لیے بھی ابھی تک ہمارے ہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔

آج جو دینی تعلیم ہم دے رہے ہیں، اس کے مقاصد کیا ہیں؟ وہ ہمارے سامنے ہونے چاہییں۔ میں ذرا بے تکلف بات کروں گا۔ آپ برا نہ مانیے گا۔ میرا تعلق آپ ہی کے طبقہ سے ہے۔ وہ ایک شعر ہے کہ

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

تو گفتگو میں تھوڑی سی تلخ نوائی کا عنصر آنے کی اجازت دیجیے۔ جب دار العلوم دیوبند قائم ہوا، اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ کیا درپیش تھا؟ اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ انگریز نے پورے برصغیر پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں کے اوقاف سب ختم کر دیے گئے تھے، ایک ایک کر کے ضبط کر لیے گئے تھے، تعلیمی ادارے سب بند کر دیے گئے تھے۔ علماء کرام جو سارے نظام کو چلا رہے تھے، ان کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا۔ عدالتوں کا نظام جو شریعت کے مطابق تھا، اس کو ختم کر

کے انگریزی عدالتیں قائم کر دی گئیں، انگریزی قانون شریعت کی جگہ نافذ کر دیا گیا۔ فارسی جو نظام حکومت کی زبان تھی، اس کو ختم کر کے انگریزی جاری کر دی گئی۔ جہاں جہاں مسلمان مقرر تھے، ان کی جگہ ہندوؤں کو مقرر کر دیا گیا۔ بڑے مناصب پر انگریز آ گئے اور مسلمان ہٹ گئے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی عزت کا ذریعہ تھیں، وہ مسلمانوں کی ذلت کا ذریعہ بنا دی گئیں۔ مسلمانوں کا لباس، مسلمانوں کے عہدے، مسلمانوں کے مناصب، مسلمانوں کے القاب، ہر چیز جو اونچے درجے کی تھی، اس کو نیچے درجے میں انھوں نے متعارف کروا دیا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ نصاب یا وہ نظام جو آسانی سے اس وقت اپنایا جا سکتا ہے، اس کو اپنا لیا جائے۔

اس وقت درس نظامی برصغیر میں رائج تھا۔ درس نظامی کیا ہے؟ یہ بھی میں عرض کر دوں۔ درس نظامی نہ کوئی آسمانی چیز ہے، نہ قرآن میں آیا ہے نہ حدیث میں، نہ اس کا اسلام کے مستقبل یا ماضی سے کوئی تعلق ہے۔ یہ ایک اچھی مفید چیز ہے، اس کی افادیت سے انکار نہیں۔ اصل میں انگریز کی حکومت جب برصغیر میں قائم ہوئی تو اس وقت ہندوستان میں چار پانچ قسم کے درس رائج تھے۔ ایک درس مشرقی ہندوستان، جون پور وغیرہ میں رائج تھا جو شیراز ہند کہلاتا تھا۔ شیراز ہند اس لیے کہلاتا تھا کہ جون پور اور مشرقی علاقوں میں عقلیات اور فلسفے پر زور زیادہ تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات منطق اور فلسفے کے ماہر ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں عقلیات پر جتنی کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں، وہ خیرآبادی سکول کی طرف سے لکھی گئیں۔ فضل حق خیرآبادی اور فضل امام خیرآبادی اس اسکول کے معروف نام ہیں اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں 'ہدیہ سعیدیہ' اور 'شمس بازغہ' وغیرہ سے آپ واقف ہیں۔

ایک دوسرا درس تھا جو افغانستان کے اثرات سے آیا تھا اور موجودہ صوبہ سرحد، افغانستان اور موجودہ پنجاب وغیرہ میں رائج تھا۔ اس میں صرف ونحو اور نحوی بحثوں پر زور دیا جاتا تھا۔ کافیہ اور اس کی شرح پڑھنے پر لوگ دس دس سال لگاتے تھے۔ کافیہ میں کیا لکھا ہے، اس سے بحث نہیں ہوتی تھی، لیکن مفرد امرفوع ہے یا منصوب یا مجرور، اس پر تین تین دن بحث ہوتی رہتی تھی۔ پھر

کافیہ کی شرح، شرح جامی پڑھائی جاتی تھی۔ پھر شرح جامی کی شرح، پھر اس کے حواشی سوال باسولی، سوال کابلی، تحریر سنبٹ وغیرہ، اور دس دس سال اس میں لگ جاتے تھے۔ بہرحال، یہ تخصص کا ایک میدان تھا۔ ان کی دلچسپی تھی جس پر ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تیسرا نصاب وہ تھا جو مغربی ہندوستان اور سندھ میں رائج تھا جس میں علم حدیث پر نسبتاً زیادہ زور تھا۔ شیخ علی المتقی، کنز العمال کے مصنف عبدالوہاب المتقی، ہمارے سندھ کے علماء کرام شیخ محمد حیات سندھی، شیخ محمد عابد سندھی اور شیخ ابوالحسن سندھی وغیرہ حضرات اس نظام سے وابستہ تھے۔ ان حضرات کا اعتنا علوم حدیث سے زیادہ تھا۔

یہ تین مختلف نظام ہندوستان میں رائج تھے اور کچھ تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ ان سے مختلف بھی تھے، لیکن بڑے انداز یہی تین تھے۔ اس کی تفصیل اگر آپ دیکھنا چاہیں تو مولانا مناظر احسن گیلانی کی ضخیم کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں دیکھ لیجیے۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے، ایسٹ انڈیا کمپنی آئی تو اس نے سب سے پہلے بعض سرحدی علاقوں بمبئی، مدراس اور کلکتہ وغیرہ پر قبضہ کیا۔ کلکتہ پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پولیس اور فوج رکھنا شروع کی جس کی ایک لمبی داستان ہے۔ آج کل اس کے parallels اور اس کی مشابہتیں بڑی نمایاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے ملک میں بدامنی ہے، آپ کے ہاں راستوں میں ڈکیتیاں بہت ہوتی ہے، اس لیے ہم اپنی جان ومال اور راستوں کو محفوظ بنانے کے لیے اپنی فوج الگ رکھیں گے۔ ان کو فوج رکھنے کی اجازت دے دی گئی اور انھوں نے راستوں پر سپاہی رکھنے شروع کر دیے۔ ہوتے ہوتے انھوں نے پورے بنگال پر قبضہ کر لیا اور بالآخر نواب سراج الدولہ کے خلاف فوج کشی کر کے اس کو demote کر دیا گیا۔ بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کر لیا اور الٰہ آباد پہنچ گئے جو مشرقی یوپی کا سب سے بڑا شہر تھا۔ جب تین صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ پر ان کا قبضہ ہو چکا تو ہندوستان میں مسلمانوں کے کان پر جوں رینگی اور یہاں کا جو حکمران تھا، غالباً شاہ عالم ثانی، وہ ان کے مقابلے کے لیے اپنی فوج لے کر نکلا۔ اس کو ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کے نتیجے میں الٰہ آباد

میں ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ دیوانی کہلاتا ہے۔ یہ معاہدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے کوئی تین سال بعد ہوا۔ اس معاہدہ میں شاہ عالم ثانی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ان تینوں صوبوں کا انتظام سپرد کر دیا یعنی اس کو قانونی طور پر ایک جائز قبضہ تسلیم کر لیا اور کہا کہ میری طرف سے آپ ان تینوں صوبوں کا نظام چلائیں گے، لیکن اس کے یہ شرائط ہوں گے۔ (انگریز ہمیشہ شروع میں شرائط مان لیتے ہیں جو ان کو سوٹ کرتے ہیں۔ پیروی اور پابندی وہ کتنی کرتے ہیں، یہ ہم سب کے سامنے ہے)

ان شرائط میں ایک بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے سارے معاملات شریعت حقہ محمد یہ کے مطابق ہوں گے۔ یہ معاملات مسلمان قاضی اور مفتی طے کریں گے کہ شریعت کیا ہے اور اس کو کیسے نافذ کیا جائے۔ یہ ان شرائط میں ایک چیز تھی۔ جب انگریزوں نے یہ شرائط مان لیں تو انگریزوں میں یہ خوبی ضرور ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ ہر کام بڑے methodical طریقے سے کرتے ہیں۔ ہر کام کا ایک نظام اور ایک سسٹم ہوتا ہے۔ پہلے قانون بنتا ہے، اس کے مطابق نظام چلتا ہے۔ تو انگریزوں نے یہ معلوم کیا کہ مسلمانوں میں کسی کو جج مقرر کرنے کے لیے اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ وہ عالم یا فقیہ ہے؟ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ تین چار قسم کے نصاب رائج ہیں اور ہر ایک کے فارغ التحصیل کو عالم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی ایسا نصاب ہونا چاہیے جو ان تینوں خصائص کا جامع ہو۔ اب ان تینوں خصائص کا جامع نظام وہ تھا جو فرنگی محل میں رائج تھا۔

فرنگی محل ایک بہت بڑے مکان کا نام تھا جو جہانگیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ جہانگیر اس زمانے میں بیمار ہوا، کئی لوگوں نے اس کا علاج کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے علاج کر دیا تو اس نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا چاہیے؟ انگریز ہمیشہ اپنی قوم کا وفادار ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میری قوم کے کچھ لوگ یہاں لکھنو میں تجارت کے لیے آئے ہیں، ان کو مشکل پیش آتی ہے تو آپ ان کو تجارت کی اجازت دے دیں اور ان کو کوئی charter یا کوئی guarantees ایشو کر دیں۔ جہانگیر نے فرمان جاری کر دیا اور لکھنو میں ایک بہت بڑا محل یا کوٹھی

ان کو دے دی۔ انگریزوں کی وجہ سے وہ کوٹھی 'فرنگی محل' کہلاتی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کسی حوالے سے اس کو خبر ملی کہ انگریزوں نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے جو جہانگیر نے طے کی تھیں اور بعض ایسے کام کیے ہیں جو حکومت کی پالیسیوں کے خلاف تھے۔ اورنگ زیب نے وہ کوٹھی ان سے ضبط کر لی اور ان کو نکال کر وہ کوٹھی ملا نظام الدین سہالوی کو دے دی جنھوں نے فتاویٰ عالم گیری مرتب کرایا تھا اور کہا کہ آپ یہاں درس گاہ قائم کر دیں۔ چنانچہ اس درس گاہ کے علما فرنگی محلی کہلانے لگے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی، عبدالوہاب فرنگی محلی، عبدالباری فرنگی محلی، یہ نام آپ نے سنے ہوں گے۔ فرنگی محل میں ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ جو نصاب تعلیم تھا، اس میں انھوں نے منطق، فلسفہ، نحو اور حدیث کے ساتھ ساتھ اصول فقہ اور فقہ کی بنیادی کتابیں بھی شامل کر دیں، اس لیے کہ وہ خود فقہ کے متخصص تھے، مفتی اور محتسب رہے تھے اور فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب میں بھی شریک رہے تھے۔

جب انگریزوں کو پتہ چلا کہ فرنگی محل کا جو نصاب تعلیم ہے، اس میں فقہ کی اچھی بنیاد موجود ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات فقہ کے ماہر ہوتے ہیں تو انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسی درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو قاضی و مفتی مقرر کیا جائے گا۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر چونکہ قاضی و مفتی مقرر ہونے لگے اور درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو ایک اچھا دنیاوی موقع ملا، ان کی تنخواہیں اچھی تھیں، ان کے وسائل اچھے تھے، معیارات اچھے تھے تو بڑے پیمانے پر مدارس نے اسی نصاب کو اپنانا شروع کر دیا اور بڑی تعداد میں انگریزوں نے اس نصاب کے فارغ التحصیل علماء کرام کو مفتی و محتسب مقرر کر دیا۔ آپ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ میں بیسیوں علماء کرام کے نام سنیں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ اسی درس نظامی کے پڑھے ہوئے تھے اور انگریزوں کے نظام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ 'صدر الصدور' تھے یعنی دہلی اور اس کے قرب وجوار کے مذہبی امور کے جتنے قاضی تھے، ان کی سربراہی ان کے پاس تھی۔ آپ انھیں اس علاقے کا چیف جسٹس کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

یہ نصاب تھا جس سے لوگ مانوس تھے اور گزشتہ کم وبیش سو برس یا ۸۰ برس سے لوگ اس نصاب کو پڑھتے پڑھاتے چلے آ رہے تھے۔ جب مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے دارالعلوم کے قیام کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بھی اسی نصاب کو اپنا لیا۔ اور لوگوں کے ساتھ وہ بھی اس نصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ ان کے والد، ان کے ساتھی دوسرے علماء کرام، مثلاً مولانا محمد یعقوب نانوتوی جو دارالعلوم کے پہلے صدر مدرس بھی منتخب ہوئے، ان کے والد مولانا مملوک علی، سب اسی نظام کے پڑھے ہوئے تھے اور وہ دہلی کالج میں، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی چلاتی تھی، عربی کے پروفیسر تھے۔ اس نصاب کو اپنانے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ دینی تعلیم بقدر ضرورت اس میں شامل تھی۔ اس میں عربی زبان بھی تھی، فقہ بھی تھی، اصول فقہ بھی تھی، حدیث بھی تھی، تفسیر کی ایک دو کتابیں بھی انھوں نے شامل کر دیں۔ حدیث کی مزید کتابیں شامل کر دیں۔ اس سے پہلے تک حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ اور ایک آدھ کتاب ہوتی تھی۔ ان حضرات نے مزید کتابیں شامل کر دیں اور ایک نیا نصاب انھوں نے بنا دیا جس نے ہندوستان کے دینی تقاضوں کو اس وقت پورا کیا۔

کیا پاکستان بننے کے بعد بھی دینی مدارس کے تقاضے یہی تھے؟ میرے خیال میں یہ نہیں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اب دینی مدارس سے تین قسم کے تقاضے ہیں اور ان تینوں تقاضوں کی ضروریات الگ الگ ہیں۔ ایک تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو مساجد ہیں، ان میں ہمیں تربیت یافتہ امام درکار ہیں۔ یہ سب سے پہلا تقاضا ہے جو مسلمانوں کی دینی زندگی کا سب سے لازمی مطالبہ ہے جسے پورا ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ایک امام مسجد کو درس نظامی پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ 'ہدیہ سعیدیہ' اور 'سوال کا بلی' اور 'سوال باسولی' اور 'تحریر سنبٹ' وغیرہ نہیں پڑھے گا تو بھی وہ ایک اچھا امام ہو سکتا ہے۔ اور اگر پڑھ لے گا تو اس کے اچھا امام بننے میں ان کتابوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اچھا امام بننے یا نہ بننے میں ان علوم وفنون کا سرے کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لیے یہ تحصیل حاصل ہے اور وقت کا بھی ضیاع ہے اور وسائل کا بھی۔ آپ نے ہزاروں ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا اور آگے چل کر کروڑوں ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جنھوں نے آٹھ دس

سال لگا کر یہ ساری چیزیں یاد کیں، پھر پچاس سال امامت کی اور پچاس سالہ امامت میں کسی نے ان سے 'ہدایۃ الحکمۃ' کا کوئی سوال نہیں پوچھا۔ ان کو کبھی 'تحریر سنبٹ' کا کوئی مسئلہ وہاں بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جو مسائل لوگ پوچھتے ہیں اور جو روزانہ دین کی راہنمائی میں درکار ہوتے ہیں، وہ تو ان کو پڑھائے نہیں جاتے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ شیئرز مارکیٹ میں پیسہ لگانا جائز ہے یا نہیں، اور ان میں سے اکثر کو یہی پتہ نہیں ہوتا کہ شیئر کہتے کس کو ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نظام اچھا امام تیار نہیں کر سکتا۔ اب ایک اچھے امام کی حقیقی ضروریات کیا ہیں، اس پر غور وفکر ہونا چاہیے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک کم از کم تعلیمی معیار کے بعد، جو میٹرک ہو سکتا ہے، آپ دینی مدارس میں طلبہ کو داخلہ دیں۔ میٹرک کے بعد حفظ قرآن لازمی ہونا چاہیے۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ دینی مدارس میں حافظ کے علاوہ کسی کو داخلہ نہیں دینا چاہیے۔ اس وقت جامعہ ازہر کے تحت جو ادارے کام کر رہے ہیں، ان میں طلبہ کی تعداد کم وبیش پندرہ لاکھ ہے جو پاکستان کے دینی مدارس کے طلبہ کی تعداد سے زیادہ ہے۔ ان کی آبادی ہم سے آدھی بلکہ اس سے بھی کم ہے، لیکن وہاں حفظ قرآن لازمی ہے۔ گویا پندرہ لاکھ حافظ طلبہ اس وقت جامعہ ازہر کے زیر انتظام اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔ اگر وہ کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟

اس کے بعد تین سال کا ایک نظام اور نصاب ایسا ہو جس میں بقدر ضرورت عربی زبان پڑھائی جائے۔ اتنی کہ طالب علم تفسیر اور حدیث کی کتابیں اور فقہ کی عام کتابیں پڑھ سکے۔ عربی زبان کے علاوہ حدیث اور علوم حدیث پر کوئی ایک آدھ جامع کتاب مثلاً مشکوٰۃ کا انتخاب یا معارف الحدیث یا کوئی اور اچھی کتاب پڑھا دی جائے۔ اسی طرح اردو کی کوئی تفسیر، مثلاً تفسیر عثمانی اور کوئی ایک عربی کی مختصر تفسیر پڑھائی جائے۔ ایک دو فقہ کی کتابیں ہوں اور کوئی ایک آدھ کتاب جدید معاشیات پر۔ اس طرح کا ایک تین سالہ کا نصاب ہو جس میں تقریر کی مشق بھی ہو اور تجوید بھی اس میں شامل ہو۔ جو یہ نصاب مکمل کر لے، وہ امام بننے کا اہل ہو اور اس کو پھر امام بننے کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ اپنا اور ادارے کا مزید وقت اور وسائل ضائع نہ کرے، اس لیے کہ اس کو اس سطح سے آگے کام نہیں کرنا۔

اب یہ ایک تقاضا ہے جس کے لیے آپ جب تک کوئی نظام نہیں بنائیں گے، وہی کچھ ہوتا رہے گا جو آج ہو رہا ہے۔ آپ ایک اور تلخی کی بات سنیے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے اور جب تک آپ حقائق کا سامنا نہیں کریں گے، مستقبل کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ آج ہمارا امام جب سوسائٹی میں جا کر یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ تو irrelevant ہے اور یہاں لوگ جو سوال کر رہے ہیں، اس کا میرے پاس جواب نہیں ہے تو وہ اپنی پڑھی ہوئی چیزوں کو relevant بنانے کے لیے وہاں وہ مسائل پیدا کرتا ہے جو اس کے اپنے مسائل ہیں تاکہ وہ لوگوں کے بھی مسائل بن جائیں اور جب وہ ان کے مسائل بن جائیں گے اور وہ پوچھیں گے تو میں ان کا جواب دوں گا۔ وہ مسائل کیا ہوتے ہیں؟ وہ فرقہ وارانہ ہوتے ہیں۔ اب جن بیچاروں کو کچھ پتہ نہیں ہوتا اور نہ کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ہوتا ہے کہ حضور نور تھے یا بشر تھے، ان کے لیے امام یہ مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واجب التعمیل ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا، لیکن ایک اس پر زور دینا شروع کرتا ہے کہ آپ بشر تھے اور دوسرا اس پر کہ آپ نور تھے۔ وہ نور کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے، یہ بشر کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے۔ اور جب علم کی کمی کی وجہ سے لوگوں کا ایک گروہ اس کام کے لیے تیار ہو جائے گا تو اب امام صاحب کی نوکری پکی ہو جائے گی اور انھیں کوئی وہاں سے نہیں ہٹائے گا۔ یہ ایک افسوس ناک بات ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔ اس کو محض تنقید کے مفہوم میں نہ لیں۔ جب تک مرض کی آپ تشخیص نہیں کریں گے، اس وقت تک اس کا علاج نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے امام کو اس کام کے لیے تیار کریں جو سوسائٹی کے relevant مسائل ہیں۔ جب اسے یہ مسائل معلوم ہوں گے تو وہ غیر متعلق مسائل پیدا نہیں کرے گا۔

اس کے بعد تعلیم کا دوسرا درجہ ان لوگوں کے لیے ہے جو دینی علوم کے مدرس یا معلم بننا چاہتے ہیں۔ آج پاکستان کے ہر اسکول اور کالج میں ایف اے تک اسلامیات لازمی ہے۔ بہت سے لوگ بی اے میں بھی پڑھتے ہیں۔ ہر کالج اور ہر اسکول میں اسلامیات کے ٹیچر ہوتے ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سرکاری اداروں سے ایم اے کر کے آئے ہیں جن کا علم بڑا ناپختہ ہوتا ہے۔ وہ اردو میں پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں اور ان میں سے بہت سے لوگ

قرآن پاک بھی ناظرہ نہیں پڑھ سکتے۔ میں نے اسلامیات کے ایسے اساتذہ دیکھے ہیں کہ جن سے نماز پڑھانے کے لیے کہا جائے تو نماز نہیں پڑھا سکتے۔ قرآن پاک کی شاید چار سورتیں بھی ان کو حفظ نہ ہوں، اس لیے کہ انھوں نے پڑھا ہی نہیں ہوتا۔ اردو میں پڑھ کر پاس کر لیتے ہیں اور اسلامیات کی ڈگری ان کو مل جاتی ہے اور وہ اسلام کے مجتہد اور مفتی بھی بن جاتے ہیں۔ یہ ایک دوسری خطرناک بات ہے جو ہو رہی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو مدرسوں کی لائن سے آئے ہیں۔ مدرسوں میں میبذی، شرح عقائد اور خیالی قسم کی جو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے، وہ یہاں کام نہیں کرتی۔ یہاں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے ہم نے ان لوگوں کو تیار نہیں کیا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ابتدائی تین چار سال کے بعد مزید تین سال کا ایک نصاب ہونا چاہیے جس کا مقصد یہی ہو کہ آپ کو اسکولوں اور کالجوں کے لیے اسلامیات کے معلم تیار کرنے ہیں۔

اس کے بعد تیسری ضرورت یہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگ درکار ہیں جو خود ان دینی مدارس میں اعلیٰ درجے کے متخصص ہوں، جو کتابیں پڑھا سکیں اور اعلیٰ درجے کے علوم وفنون کی تدریس کر سکیں۔ ہمیں فقہا درکار ہیں، محدثین درکار ہیں، مفسرین درکار ہیں، مفتی درکار ہیں جو ان سب علوم کے متخصص ہوں۔ اس کے لیے الگ سے چار پانچ سال کی تیاری چاہیے۔ جب تک وہ تیاری نہیں ہوگی، مطلوبہ افراد تیار نہیں ہوں گے۔ اس وقت درس نظامی میں کیا ہوتا ہے؟ درس نظامی میں سب سے neglected چیز قرآن پاک ہے، جس پر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے۔ اب بعض مدارس میں ترجمہ قرآن شروع ہو گیا ہے۔ اول سے آخر تک ترجمہ پڑھا دیتے ہیں جس کی نوعیت اس عام درس سے مختلف نہیں ہوتی جو عام مسجدوں میں ہوتا ہے جس میں بیٹھ کر لوگ سن لیتے ہیں۔ ایک عالم صاحب نے درس دے دیا، لوگوں نے عقیدت سے سن لیا۔ کچھ یاد رہا، کچھ یاد نہیں رہا۔ اسی طرح سے مدرسوں میں جو درس ہوتا ہے، وہ اکثر لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔ جو تفسیر پڑھاتے ہیں، وہ بیضاوی کی سورہ بقرہ ہے۔ میرے خیال میں بیضاوی کوئی اچھی تفسیر نہیں ہے۔ میں امام بیضاوی کے پورے احترام کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں۔ نہ وہ تفسیر کا اچھا نمونہ ہے، نہ کسی اور چیز کا۔ تفسیر

بیضاوی انھوں نے کیوں لکھی؟ وہ اصل میں متکلم تھے اور اصول فقہ کے آدمی تھے۔ انھوں نے بطور متکلم یہ دیکھا کہ زمخشری کی تفسیر بڑی مقبول ہو رہی ہے اور اس کے ہاں معتزلی عقائد ہیں تو انھوں نے کہا کہ زمخشری کی تفسیر سے اس کے جو بلاغت کے نکتے ہیں، وہ لے لیے جائیں اور معتزلی عقائد کو نکال کر اشعری عقائد اس میں ڈال دیے جائیں اور اس طرح سے تفسیر بیان کر دی جائے۔ اب جن جن باتوں میں انھوں نے زمخشری کی تردید کی ضرورت سمجھی، وہ ساری سورہ بقرہ میں آ گئیں، اس لیے وہ تو بڑی لمبی ہو گئی اور باقی تفسیر میں بس مختصر حواشی ہیں جنھیں کوئی پڑھتا نہیں۔ چنانچہ عملاً تفسیر قرآن تو طلبہ کو پڑھائی نہیں جاتی۔ میں نے جید علما میں سے بھی بہت سوں کو دیکھا کہ علم تفسیر سے واقف ہیں، نہ علوم قرآن میں جو مسلمانوں کے کارنامے ہیں، ان سے آشنا ہیں۔ اکثر لوگوں کو بڑی تفسیروں کے نام بھی پتہ نہیں ہوتے۔ آپ چاہیں تو بیضاوی کے کسی استاد سے پوچھ لیں کہ دس بہترین تفسیروں کے نام بتا دیں تو شاید طبری اور ایک آدھ کے علاوہ وہ چھٹا ساتواں نام نہ بتا سکیں۔ یہ اکثر صورتوں میں واقفیت کا عالم ہوتا ہے۔ بعض صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

اب اگر قرآن پاک ہمارے علوم وفنون کی اساس ہے تو پھر اس کو فی الواقع تعلیم کی بھی اساس ہونا چاہیے۔ یہ بات کہ آپ نے پہلے طالب علم کو ساری چیزیں پڑھا کر اس کے ذہن کا ایک سانچہ بنایا، اس کے بعد اس سانچے کے مطابق آپ اسے قرآن پڑھا رہے ہیں، یہ میرے خیال میں قرآن کی توہین ہے۔ قرآن اصل سانچہ ہے۔ قرآن کے سانچے سے باقی علوم کو جانچنا چاہیے۔ باقی علوم کے سانچے سے قرآن کو نہیں جانچنا چاہیے۔ کسی کو اچھا لگے یا برا لگے، میں اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ قرآن معیار ہے، قرآن اصل کسوٹی ہے، قرآن کے معیار اور کسوٹی پر فقہ اور اصول فقہ اور عقائد اور ہر چیز کو جانچنا چاہیے۔ ہم پہلے متاخرین کے عقائد اور فتاویٰ پڑھا کر طالب علم کا ایک ذہن بناتے ہیں، پھر اس ذہن سے کہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کو توڑ مروڑ و اور توڑ مروڑ اس کے مطابق ایڈجسٹ کرو۔ یہ میرے خیال میں قرآن کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ اس لیے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ علوم قرآن کی تعلیم کا ایک نیا نظام ہونا چاہیے۔ کیا ہونا چاہیے؟ اس پر کبھی بات ہوگی تو اس پر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ علوم قرآن میں

تخصص موجودہ درس نظامی سے حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اپنی ذاتی دلچسپی یا ذوق سے پیدا کر لیں تو کر لیں، نظام میں اس کا بندوبست نہیں ہے۔ کوئی inherent mechanism نظام میں نہیں ہے کہ قرآن کے متخصصین پیدا ہوں۔

یہی حال علم حدیث کا ہے۔ علم حدیث کا متخصص از خود کوئی پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ انور شاہ کشمیری کی طرح کے کسی آدمی کو پیدا کر دے تو کر دے، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر جو لوگ تیار ہوتے ہیں، ان میں کوئی علم حدیث کا متخصص نہیں ہوتا۔ ان کو محض چند فقہی موضوعات سے متعلق وہ حدیثیں یاد ہوتی ہیں جن میں فقہاے احناف کا کوئی کلام یا فقہاے شوافع کا کوئی مستدل ہے۔ مدارس میں تین تین ماہ تک اس پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ یہاں لوگوں کے ایمان ضائع ہو رہے ہیں۔ لوگ ایمان ہی کو نہیں مان رہے کہ ایمان بھی کوئی چیز ہے۔ اور اس کو چھوڑ کر آپ تین مہینے اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے کسی کو بحث نہیں۔ آپ نے ایمان کے بارے میں کیا فرمایا، وہ کسی کا concern نہیں۔ لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے کسی مقتدا یا پیشوا کے نقطہ نظر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت کر دیں۔ اس کے بعد اگلے چھ مہینے ان احادیث پر خرچ ہو جاتے ہیں جن میں فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کی طرح کے اختلافی موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جو طالب علم سب سے تیز پڑھنے والا ہوتا ہے، اس کو کہتے ہیں کہ تم پڑھو اور روزانہ چالیس صفحے پڑھو۔ نہ استاد کو اس سے کوئی بحث ہوتی ہے اور نہ شاگردوں کو ہی کچھ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی، جو ساری شریعتوں کا ناسخ اور ہر چیز کا معیار ہے اور جس کے بعد ہر بات کالعدم ہے، اس میں کیا بات کہی گئی ہے۔ کتب حدیث کی شروح کو دیکھ لیجیے۔ جو شروع کی بحثیں ہیں، ان میں ایک باب تین جلدوں میں آیا ہے تو دوسرا باب چار جلدوں میں، جبکہ آخر میں تین تین چار چار سطروں کے حاشیے ہیں کہ کذا قال فلان یا انظر فلانا۔ یہ شرحوں کی کیفیت ہے۔ تو حدیث میں بھی کوئی تخصص مدارس میں پیدا نہیں ہوتا۔ فقہ میں تخصص کی صورت حال بھی یہی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان دو مرحلوں

کے لیے متخصصین کے لیے ایک نیا نصاب ہو جس میں درس نظامی کی ساری کتابیں شامل ہوں۔ درس نظامی کی کسی کتاب کو میں متخصصین کے لیے غیر ضروری نہیں سمجھتا، لیکن اس کے ساتھ مزید بہت کچھ شامل کرنا ضروری ہے تاکہ واقعی ایسے متخصص پیدا ہوں جو اس فن یا علم کو آگے چل کر بڑھا سکیں۔

یہ تین درجے تو عام ہیں جن کی ہر وقت ضرورت ہے۔ ان کے بعد ایک درجہ اور ہے جس کے لیے مزید محنت درکار ہے۔ یہ درجہ وہ ہے کہ جو مغربی علوم وفنون کی تنقیح کا فریضہ انجام دے اور ناقدانہ جائزہ لے کر یہ بتائے کہ ان میں کیا چیز کمزور ہے اور کیا چیز مضبوط ہے، کون سی بات اسلام کے مطابق ہے اور کون سی اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان میں جو فقہ کا متخصص ہو، وہ مغربی قانون کا تنقیدی جائزہ لے۔ جو فقہ المعاملات کا متخصص ہو، وہ ان کی معاشیات کا جائزہ لے۔ جو اصول فقہ کا متخصص ہو، وہ ان کے اصول قانون کا جائزہ لے۔ اس میں کتنا وقت لگے گا، کتنے لوگ تیار ہوں گے، یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن جب تک یہ سارے کام نہیں ہوں گے، اس وقت تک امت مسلمہ کا مستقبل اس طرح بن نہیں سکتا جس طرح ہم بنانا چاہتے ہیں۔ آج صورت یہ ہے کہ نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام سے واقف نہیں ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تو ہے اور ان میں بہت سے اچھے مسلمان بھی ہیں، لیکن جذباتی وابستگی کی بنیاد پر عمارت بنانے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ ریت پر بیس منزلہ عمارت بنانا چاہیں۔ جیسے وہ قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح یہ عمارت بھی لازماً گر جائے گی۔ چنانچہ جب تھوڑی سی ایسی بات آتی ہے جو اس طبقے کے خیالات سے مختلف ہو تو وہ فوراً اس پر تاویلیں کرتے ہیں، کیونکہ intellectual framework نہیں ہے، اس کا انفراسٹرکچر نہیں ہے۔ اس کے لیے وقت درکار ہے۔ وہ ایک دو دن میں نہیں ہوگا۔ کسی وعظ یا مطالبے یا بینر یا دھرنے سے نہیں بنے گا۔ اس کے لیے لگ کر کام کرنا پڑے گا۔

حاضرین محترم! یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں اسلامی علوم وفنون کے طلبہ سے کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ آپ اس میدان کے شہسوار ہیں اور اس ضرورت کی تکمیل کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے، اس لیے میری گفتگو میں تھوڑی سی تلخی آ گئی جو میں نے جان بوجھ کر شامل کی تاکہ اس تلخی کا

احساس آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ہم جو بات کر رہے ہیں، اس کا تعلق کسی ذہنی عیاشی یا محض فکری سرگرمی سے نہیں ہے، بلکہ وہ واقعی بڑی اہم بات اور مسلمانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

میں ایک شعر پر بات ختم کرتا ہوں۔ فارسی کا شعر ہے:

نوائے من ازاں پرسوز و بے باک و غم انگیز است

بخاشاکم شرار افتاد و باد صبح دم تیز است

یعنی میں اس لیے تلخ باتیں کر رہا ہوں کہ میرے آشیانے کو آگ لگ گئی ہے، اور ہوا تیز ہے اور مجھے جلدی بچانے کی ضرورت ہے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ آشیانے کو آگ لگ چکی ہے اور باد صبح دم تیز ہے۔ آشیانہ جل جانے کا خطرہ ہے اور بہت جلد اس کو بچانے کی ضرورت ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے
تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے

الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام تربیتی ورکشاپ

(منعقدہ ۱۴ر نومبر ۲۰۰۶)

تربیتی ورک شاپ کی مختصر روداد

۱۴؍نومبر ۲۰۰۶ کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ''دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے'' کے عنوان پر ایک روزہ ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا جس میں مختلف دینی مدارس اور کالجوں کے اساتذہ نے شرکت کی۔ پہلی نشست کی صدارت بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی نے کی، دوسری نشست مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا حاجی محمد فیاض سواتی کی زیر صدارت منعقد ہوئی جبکہ تیسری نشست کی صدارت کے فرائض اکادمی کے ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی نے انجام دیے۔

ورکشاپ سے خطاب کرنے والوں میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ جامعہ اسلامیہ کامونکی کے مہتمم مولانا عبدالرؤف فاروقی، پاکستان شریعت کونسل صوبہ پنجاب کے امیر مولانا عبدالحق خان بشیر، پروفیسر حافظ منیر احمد، پروفیسر محمد اکرم ورک، پروفیسر میاں انعام الرحمٰن اور دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے صدر پروفیسر ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے بطور مہمان خصوصی خطاب کیا، جبکہ الشریعہ اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف نے گزشتہ سال کی رپورٹ اور آئندہ سال کے پروگرام کی تفصیل پیش کی۔

ورکشاپ کی ایک نشست دینی مدارس کے اساتذہ کے درمیان باہمی مشاورت کے لیے مخصوص تھی جس میں اساتذہ نے ورکشاپ میں مختلف حضرات کی طرف سے کی جانے والی گفتگو کی روشنی میں تبادلہ خیالات کیا اور متعدد سفارشات پیش کیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

☆ دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے ایک مستقل تربیتی نظام کی ضرورت ہے جس کا اہتمام دینی مدارس کے وفاقوں اور ملک کے بڑے دینی اداروں کو کرنا چاہیے۔ اس نظام میں ایسا جامع کورس ترتیب دیا جائے جو فکری، روحانی، اخلاقی، علمی اور فنی حوالوں سے اساتذہ کو ضروری تقاضوں سے باخبر کرنے اور ان کے مطابق ان کی عملی تربیت پر مشتمل ہو اور اس میں تعلیمی اور فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ حالات زمانہ اور مستقبل کی ضروریات کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہو۔

☆ دینی مدارس کے مہتمم حضرات کو توجہ دلائی جائے کہ وہ کسی استاذ کے انتخاب کے لیے اپنی موجودہ اور روایتی ترجیحات کا از سرِ نو جائزہ لیں اور ادارہ سے وابستگی اور علمی استعداد اور ذوق تدریس کے ساتھ ساتھ فکری رجحانات اور اخلاقی و دینی معیار کا بھی لحاظ رکھیں اور اجتماعی وملی سوچ اور وسیع تر دینی مفادات کو ترجیح دی جائے۔

☆ بڑے دینی مدارس میں سال کے مختلف حصوں میں اساتذہ کے لیے تین روزہ ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے جن میں انہیں تعلیم وتدریس کے فنی تقاضوں اور دینی وفکری تربیت کی ضروریات کی طرف توجہ دلائی جائے اور جدید تحقیقات ومعلومات سے انہیں آگاہ کیا جائے۔

☆ دینی مدارس اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو صرف دینی مدرسہ کی چار دیواری تک محدود نہ رکھیں بلکہ اردگرد بسنے والے عام مسلمانوں کو بھی اپنے تعلیمی نظام میں شریک کریں اور ان کے لیے ترجمہ قرآن کریم، عربی گریمر اور فہم دین کورس کا اہتمام کریں، وغیر ذلک۔

اس موقع پر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اس سال اکادمی میں دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تین ریفریشر کورسز کا اہتمام کیا جائے گا جن میں سے پہلا تین روزہ کورس محرم الحرام کے آخر میں اس عنوان پر ہوگا کہ ائمہ مساجد اور مدرسین کے ساتھ تعلیمی رابطہ کس طرح استوار کرنا چاہیے۔

خطبہ استقبالیہ

اسلام کا تصور علم اور دینی مدارس کا کردار

ــــ ابوعمار زاہد الراشدی ــــ
[ڈائریکٹر، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ]

علم انسان کا وہ امتیاز ہے جس نے انہیں فرشتوں پر فضیلت عطا کی اور معلّم وہ منصب ہے جسے سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اپنے تعارف کے طور پر پیش کیا کہ 'انما بعثت معلما' (میں معلم اور استاذ بنا کر بھیجا گیا ہوں)، جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی پہلی وحی قراءت، قلم اور تعلیم کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اسی لیے اسلام میں تعلیم کے مشغلہ اور معلم کے منصب کو ہمیشہ عزت اور وقار کا مقام حاصل رہا ہے اور دنیا کی ہر مہذب اور متمدن قوم میں معلم کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ البتہ اسلام نے معلم خیر اور معلم شر کا فرق ضرور کیا ہے اور علم کو نافع اور ضار کے شعبوں میں تقسیم کر کے خیر و نفع کے معلم کو فضیلت و وقار کے مقام سے نوازا ہے جبکہ شر اور ضرر کا باعث بننے والے علوم کی مذمت کرتے ہوئے ان کی تعلیم کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ شیطان بھی اصل میں ایک معلم ہی تھا لیکن چونکہ اس نے شر اور ضرر کا راستہ اختیار کر لیا تھا، اس لیے راندۂ درگاہ قرار پایا اور قیامت تک کے لیے لعنت کا طوق اس کی گردن میں پڑ گیا۔

اسلام علم برائے علم کا قائل نہیں ہے بلکہ صرف ان علوم کو اپنے تعلیمی نظام کے دائرہ میں جگہ

دیتا ہے جو انسان اور انسانی سوسائٹی کے لیے نفع اور خیر کا باعث ہوں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو اور اس نوعیت کے دیگر علوم کی فنی اور واقعاتی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی تعلیم وتعلّم سے منع فرمایا ہے، بلکہ قرآن کریم نے تو جائز علوم کی بھی درجہ بندی کر کے یہ اصول پیش کیا ہے کہ ہر علم ہر شخص کے لیے موزوں نہیں ہے، بلکہ ذہنی سطح، منصبی فرائض اور مقام وحیثیت کو ملحوظ رکھ کر تعلیم وتعلّم کے لیے مضامین کے انتخاب کی سمت قرآن کریم نے راہنمائی فرمائی ہے جیسا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا ہے کہ: 'وما علمناه الشعر وما ینبغی له' (ہم نے آپ کو شعر وشاعری نہیں سکھائی اور وہ آپ کے لیے مناسب بھی نہیں ہے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی علم کا حصول صرف اس لیے ضروری یا مناسب نہیں ہو جاتا کہ وہ علم ہے بلکہ ضرورت ومناسبت کے لیے یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ علم حاصل کرنے والے کو اس کی عملی زندگی میں اس علم کی کس حد تک ضرورت ہے اور وہ اس کے لیے کس درجہ میں مناسب حال ہے۔

اسلام نے علم کو نافع اور ضار کے درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ نفع وضرر دنیا اور آخرت دونوں حوالوں سے ہے اور آج کے عالمی تعلیمی نظام اور اسلام کے فلسفہ تعلیم میں یہی جوہری فرق ہے کہ آج کی دنیا کے نزدیک نفع وضرر صرف اس دنیا کے حوالے سے ہے۔ جو بات اس دنیا کی زندگی کو بہتر بنانے اور شخصی، طبقاتی یا اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے مفید ہے، وہ تعلیمی نظام کا حصہ ہے لیکن اسلام اس دنیا کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ آخرت کی فوز وفلاح اور اس ابدی زندگی میں نجات کو اپنے تعلیمی وتربیتی نظام کا اساسی ہدف قرار دیتا ہے۔ اسلام اس دنیا کی زندگی اور اس کی بہتری اور کامیابی کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے ہر جائز صورت کو اختیار کرنے کی اجازت بلکہ بعض صورتوں میں حکم دیتا ہے مگر اس شرط اور ترجیح کے ساتھ کہ دنیا کی زندگی کی آسائش، سہولتیں اور اس کی بظاہر بہتری کی کوئی صورت انسان کی اخروی زندگی میں اس کے لیے خرابی کا باعث نہ بن جائے اور دنیاوی زندگی کی سہولتیں اخروی نجات کی قیمت نہ ہوں۔

میری طالب علمانہ رائے میں اسلام نے علوم کو دنیاوی اور دینی حوالے سے تقسیم نہیں کیا بلکہ

نفع وضرر کوعلوم کی تقسیم کا باعث سمجھا ہے اور یہ نفع وضرر دنیا اورآخرت دونوں حوالوں سے ہے۔اس لیے جوعلوم انسان کے لیے فرد اور معاشرہ کے دونوں دائروں میں اس کی آخرت کی نجات اور فوز و فلاح اور دنیا کی زندگی کوزیادہ سے زیادہ بہتر، پرامن اور باسہولت بنانے کے لیے مفید ہے، وہ اسلام کی نظر میں مطلوب علم ہے، اور جوعلم ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے لیے نقصان کا باعث بنتا ہے، وہ علوم ضارہ میں شمار ہوتا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اسی سمت ہماری راہ نمائی کرتی ہے کہ ''اے اللہ! مجھے وہ علم عطا فرما جو نفع بخش ہو اور اس علم سے محفوظ رکھ جو ضرر کا باعث ہو یا نفع بخش نہ ہو۔'' میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دینی مدارس میں تعلیم کا انتظام کرنے والے ارباب بست وکشاد اور تعلیم وتدریس کا فریضہ انجام دینے والے اساتذہ کو آج کے عالمی ماحول میں اس کے تعلیمی فلسفہ ونظام کی اس بنیاد اور امتیاز کو ہر وقت سامنے رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنے زیر تعلیم اور زیر تربیت افراد کو ایک بہتر انسان اور مسلمان کے طور پر اچھی زندگی گزارنے کے قابل بنانے کے ساتھ ساتھ پوری انسانی سوسائٹی کے سامنے اسلام کے صحیح نمائندہ کا مقام دے سکیں۔

اب سے کم وبیش ڈیڑھ سو سال قبل جب ہمارے معاشرہ میں دینی مدارس کا یہ نظام وجود میں آیا تھا، اس وقت ہمارے بزرگوں کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ جنوبی ایشیا کے مسلم معاشرہ میں مسجد و مدرسہ کا ادارہ موجود رہے اور اسے امام، حافظ، قاری، مدرس، مفتی اور خطیب کے طور پر رجال کار ملتے رہیں تاکہ مسلمانوں کی عبادات اور دینی تعلیم کے ماحول اور تسلسل کو باقی رکھا جا سکے اور اس میں کوئی تعطل یا رکاوٹ نہ ہو۔ بحمد اللہ ہمارے دینی مدارس اپنے اس مقصد اور ہدف میں کامیاب ہیں اور آج بھی اس پورے خطے میں مسجد و مدرسہ کے ادارے کے لیے ضروری رجال کار یہ دینی مدارس فراہم کر رہے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ضروریات کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی دینی راہ نمائی کا تقاضا بڑھ رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ وقت کی ضرورت ہے بلکہ ہماری ذمہ داری بھی ہے۔ اسی طرح آج کی گلوبل دنیا اور مستقبل کا بین الاقوامی ماحول ہمیں اس طرف توجہ دلا رہا ہے کہ ہم اپنے محدود اور مقامی وعلاقائی ماحول کا اسیر رہنے کی بجائے عالمیت، گلوبلائزیشن اور بین الاقوامیت کے تقاضوں اور ضروریات کو بھی سمجھیں اور اس کے لیے اپنے

تعلیمی نصاب اور تربیتی نظام میں جس ردو بدل اور تنوع کی ضرورت ہو، اس سے گریز نہ کریں تا کہ دینی مدارس اپنے مستقبل کے کردار کو امت مسلمہ کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکیں۔ ہمارے اکابر نے ہر دور میں یہ عمل سرانجام دیا ہے اور آج بھی یہ عمل ہم سے پیش رفت کا متقاضی ہے۔

ان تمام امور کے حوالہ سے سب سے پہلی ضرورت دینی مدارس کے اساتذہ کو اس طرف توجہ دلانے، انہیں وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی ضروریات سے آگاہ کرنے اور فکری، علمی اور فنی طور پر اس کے لیے تیار کرنے کی ہے اور اسی مقصد کے لیے اس ورکشاپ کا اہتمام کیا گیا ہے تا کہ ہم باہمی مشاورت اور تبادلہ خیالات کے ذریعہ اس سلسلے میں کوئی قابل عمل پروگرام وضع کر سکیں۔

میں تمام مہمانان گرامی اور شرکائے محفل کا تشریف آوری پر شکریہ ادا کرتے ہوئے ملتمس ہوں کہ اس بارے میں ہماری راہ نمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کارِ خیر کو بہتر طور پر آگے بڑھانے کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

تعلیم وتعلم کے اسلامی آداب

ـــــ مولانا مفتی محمد عیسیٰ خان گورمانی ـــــ
[سابق صدر دارالافتاء، مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ]

بعد الحمد والصلوٰۃ

محترم بزرگو، دوستو، اور علماے کرام!

آج الشریعہ اکادمی میں جو موضوع ہمارے زیر بحث ہے، یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس کی تفصیلات ہیں اور اس کا بہت عظیم پس منظر ہے۔ جس طرح حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے میں اپنی پوری بعثت کا اظہار فرمایا ہے: 'انما بعثت معلما'۔ دو جماعتیں تھیں: ذاکر اور فاضل، کہ تسبیح وتہلیل کی جماعت بھی خیر پر ہے اور یہ جو حلقہ ہے جس کا مسلم شریف میں ذکر ہے، یہ علمی حلقہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں معلم مبعوث کیا گیا ہوں تو میں اس حلقے میں بیٹھتا ہوں۔

اللہ جل شانہ نے آپ کو یہ مقام عطا فرمایا ہے کہ اپنا رسول بھیجا اور اہل ایمان پر بہت بڑا احسان کیا۔ اس سے بڑا احسان اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہی ہم نے ایک شخص کو رسول مبعوث کیا۔ اس کا کام کیا ہے؟

'یتلوا علیھم اٰیتہ' وہ اللہ کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی عربی، قوم بھی عربی، کتاب بھی عربی اور گویا کہ ایک تذکیر ہے، وعظ ہے، ایک بیان ہے۔

'واوحی الی ھذا القران لانذرکم بہ ومن بلغ'۔ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا تاکہ تم کو میں ڈراؤں براہ راست اس زبان میں جس کو تم سمجھو اور جس سے تمھاری اصلاح ہو، اور بعد کی دنیا جس کو قرآن پہنچے، تراجم کے ذریعے سے، تفاسیر کے ذریعے سے، مدارس کے ذریعے سے اور وہ اپنے اپنے اہل زبان علما کے ذریعے سے ان کو سمجھائیں۔ یہ قیامت تک کے لیے ہے، لیکن میں تمہیں براہ راست یہ سنا رہا ہوں، اور میرا تلاوت کرنا یہ انذار ہے۔

اس کے بعد فرمایا: 'ویعلمھم الکتاب والحکمۃ' کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ایک درجہ اس سے بڑھ کر ہے۔ تذکیر اور وعظ و بیان تو تلاوت سے ہو گیا۔ اس کی تعلیم، اس کے آداب، اس پر عمل کرنے کے آداب اور طریقوں کی تشریح، یہ تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت ہے۔ اس کے بعد ویزکیھم، تلاوت سے تزکیہ بھی ہے۔

اور ہم دیکھیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسے کیسے سمجھا، اس بوجھ کو کیسے اٹھایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مجالس ومحافل ہوتی تھیں، وہ علم کی یا پھر فیضان کی مجالس ہوتی تھیں۔ ان میں ہر ہر شخص اپنی اپنی استعداد اور فراست کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کرتا تھا اور پھر اس میں اتنی حرص ہوتی تھی کہ وہ دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں اپنے ناقص خیال میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسے کے سب بہترین طالب علم تھے۔ سیدنا ابو ہریرہؓ فتح خیبر میں مسلمان ہوئے، چند سال پائے، ساڑھے تین چار سال اور انہوں نے کیا مقام حاصل کیا! بخاری شریف میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگ مجھ پر طعن کرتے ہیں کہ اسے اتنی احادیث کیسے یاد ہیں۔ مہاجرین تجارت میں اور انصار کھیتی باڑی میں مصروف ہوتے تھے اور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ملازم صحبت تھا۔ جب آپ گھر میں تشریف لے گئے، پھر جب آپ باہر تشریف لائے تو میں نے آپ کی مجلس کو کبھی نہ چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند کریم نے یہ مقام عطا فرمایا۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایک شخص نے ان پر اعتراض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج عشا کی نماز میں کون سی سورۃ تلاوت کی ہے؟ اس نے کہا، مجھے تو یاد نہیں،

تو فرمایا پھر اعتراض کرتا ہے ابو ہریرہؓ پر؟ تجھے اتنی بات یاد نہیں ہے۔ یہ بھی ہے بخاری شریف میں کہ حضرت ابو ہریرہ کو فاقے پر فاقے پیش آتے تھے، لیکن انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانے کو نہیں چھوڑا۔ تو اس میں ایک معلم کے لیے بھی درس ہے اور متعلم کے لیے بھی۔ معلم کے لیے یہ ہے کہ خدائے ذوالجلال سے طلب کرے کہ یا اللہ! مجھے ایسے شاگرد دے اور ایسے ہونہار، شائق، حریص اور ذہین طالب نصیب فرما اور ان کا خیال بھی رکھے اور ان کی تربیت بھی کرے۔ اور متعلم کے لیے یہ ہے کہ وہ ہر حال میں علم حاصل کرنے کے لیے ڈٹ جائے۔ کسی بھی حال میں وہ اس سے غافل نہ ہو۔ چنانچہ ابو ہریرہ نے فرمایا کہ میں بھوکا تھا کہ اس حال میں حضرت ابوبکرؓ آئے۔ پوچھا کہ ابو ہریرہ، کیا حال ہے؟ میں نے کہا: 'استقرئ'۔ علما سمجھتے ہیں کہ اگر اس کا مادہ قری یقری ہو تو معنی ہوتا ہے میں مہمانی طلب کرتا ہوں، اور اگر قرا یقرء ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ آپ سے کچھ پڑھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ کچھ پڑھنا چاہتے ہیں۔ ایک آیت کی تفسیر بتلائی اور چلے گئے۔ اتنے میں حضرت عمر آ گئے۔ ان سے پوچھا کیا حال ہے؟ ابو ہریرؓ نے کہا 'استقرئ'۔ انہوں نے بھی ایک آیت کی تفسیر بتلائی اور چلے گئے۔ اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے پوچھا۔ آپ چونکہ اپنے شاگرد کی زبان اور حال کو سمجھتے تھے، اس لیے آپ نے اس کے لیے کچھ انتظام کیا اور اس کی حاجت پوری کر دی' مہمانی دے دی۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ، مجھے حفظ نہیں ہوتا، ضبط نہیں ہوتا' میرے حفظ کے لیے دعا کر دیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: چادر پھیلا دو، جب میں اپنا بیان ختم کروں تو اس کو اپنے سینے سے لگا لو۔ بخاری شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور حضرت ابو ہریرہ کے دامن کی طرف اشارہ کیا۔ اس کو ایک ادیب اپنی زبان میں یوں ادا کرتے ہیں کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیضان الٰہی کی دولت کف حضرت ابو ہریرہ کی چادر میں ڈال دی۔''

تو علم میں حفظ اور ضبط کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ دیکھ لیں کہ اللہ جل شانہ نے، جو کہ علم کا

اصل ماخذ ہیں اور معلم اول ہیں، کتاب اللہ میں فرمایا: لا یاتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه تنزیل من حکیم حمید۔ تو اس کا معنی یہ ہے کہ استاد نے جو کچھ درس میں پڑھانا ہے، اس کا اس کے ذہن میں پوری طرح استحضار ہو یعنی ضبط اور حفظ ہو کہ میں نے آج یہ بیان کرنا ہے۔ اور جو کچھ اس نے بیان کرنا ہے، اس پر اسے ایمان کے درجے کا یقین ہو۔ پھر دیکھیں اس کا کتنا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں کہ طلبہ کی نظر استاد پر ہو اور استاد کی نظر کتاب پر ہو، وہ اسی وقت سمجھنا چاہے، پڑھنا چاہے تو کیا فائدہ ہوگا۔ استحضار، موضوع پر تیاری اور یقین کامل ہو، پھر وہ بیان کرے، اس کا آگے فائدہ ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے فرمایا: 'علمه شدید القوی ذو مرة فاستویٰ وهو بالافق الاعلیٰ'، سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تعلیم دی۔ شدید القویٰ یہ ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے تلقی کی اور قوت کے ساتھ شیاطین اور ان کی دست برد سے اس کی حفاظت کی۔ اس سے وہ پیغام اور تعلیم کوئی چھین سکے، ایسا نہیں ہے۔ وہ ذومرۃ اور شدید القویٰ ہے۔ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا کیا واسطہ ہے؟ فاستویٰ وهو بالافق الاعلیٰ کہ آنحضرت نے اس کو پہلی دفعہ الافق الاعلیٰ میں دیکھا۔ ثم دنا فتدلیٰ، قریب ہوئے، اور زیادہ قریب ہوئے۔ فکان قاب قوسین او ادنیٰ کہ طالب علم کو استاد سے تلقی کے وقت قریب ہونا چاہیے اور اس کو شناسائی ہونی چاہیے۔ استاد کا مقام ومرتبہ پہچاننا چاہیے تا کہ اس سے اچھی طرح وہ تربیت حاصل کر سکے۔

اور اگر ہم اس سلسلے کو دیکھیں کہ کیسے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جبریل علیہ السلام کا بیان کیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ استاد کو کیا مقام حاصل ہونا چاہیے۔ فرمایا: 'انه لقول رسول کریم'، یہ قرآن کس کی زبان سے نکلا ہے؟ رسول کریم جبریل، صاحب کرامت، ذی قوة عند ذی العرش مکین قوت والے سے، اس سے کوئی چھین نہیں سکتا، کسی کی مجال نہیں۔ اور اس نے اس کی تلقی براہ راست اصل معلم سے کی ہے۔ عند ذی العرش مکین۔ تو استاد کو ذی وجاہت اور باہمت ہونا چاہیے اور اپنے علوم اور اپنے موضوعات کی تیاری کا خاص خیال رکھنا

چاہیے۔ مطاعٍ، وہ مطاع ہے اور باقی جو فرشتے ہیں، سارے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ ثم امین، امانت دار بھی ہے۔ امین ہونا، مطاع ہونا، ذی وجاہت ہونا، ذی قوۃ ہونا، براہ راست تلقی کرنا، یہ ایسی چیزیں ہیں جن میں ہمارے لیے کافی درس ہے کہ ہمیں اپنے منصب درس پر بیٹھنے کے لیے کیا کیا مراتب و مقامات حاصل ہونے چاہییں۔ اگر شاگرد کی عقیدت استاد سے کرامت کی بھی ہے کہ وہ اس کو بزرگ سمجھتا ہے، کتاب کی بھی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ کتاب کے بغیر علم حاصل نہیں ہوگا، اور وہ سمجھتا ہے کہ میرا استاد کامل ہے، مکمل ہے، پھر اس کو فائدہ حاصل ہوگا۔ اس کے بغیر فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد فرمایا کہ لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه و قرآنه فاذا قرا نٰه فاتبع قرآنه ۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبریل کے ساتھ ساتھ پیچھے روانی کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے۔ پڑھنے کا مطلب جہراً پڑھنا نہیں، بلکہ آپ زبان ہلاتے تھے تاکہ وہ تلفظ میں بھی آ جائے اور دماغ میں بھی اتر جائے۔ تو کہا گیا کہ آپ ہماری قراءت کو سنیں، اس کو ذہن نشین کریں' پھر اس کا اتباع کریں اور ہم وہی وحی آپ کی زبان پر جاری کر دیں گے اور اس کا مفہوم و مطلب بھی آپ کو سمجھا دیں گے۔ تو طالب علم اس طرح دھیان سے بیٹھے کہ استاد کی بات کو غور سے سنے' سمجھے' ذہن نشین کرے' پھر اس کا تکرار کرے تو اس طریقے سے کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

آپ اس سے سمجھ لیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام صاحب شریعت تھے اور ان کو ایسا مقام حاصل تھا کہ دنیا میں کسی پیغمبر کو حاصل نہیں ہوا۔ وہ صاحب کلام بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ سے براہ راست کلام کیا، تلقی کی۔ اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا کہ میرے ایک بندے کے پاس جاؤ اور اس سے علم حاصل کرو تو سیدنا خضر کو کتنی تواضع سے، کتنی لجاجت سے کہتے ہیں: 'هل اتبعك علىٰ ان تعلمن مما علمت رشدا' ۔ میں آپ کی اتباع کرنا چاہتا ہوں تاکہ جو علم اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے، آپ مجھے سکھائیں۔ سیدنا خضر نے فرمایا کہ 'انك لن تستطيع معي صبرا، و كيف تصبر علىٰ مالم تحط به خبرا'۔ تو صبر نہیں کر سکے

گا۔تو فرمایا کہ ستجدنی ان شاء الله صابرا و لا اعصی لك امرا، آپ مجھے علم کے حصول کے سلسلے میں صابر پائیں گے، میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔

حضرت مولانا غلام رسول صاحب انھی والے اس پچھلے دور میں معقول و منقول کے بڑے شیخ تھے۔ان کو تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کا استحضار تھا۔فرماتے تھے کہ جب میں پڑھانے لگتا ہوں تو محشی کانپتے ہیں کہ کہیں غلام رسول ہماری غلطی نہ نکال دے۔تو ان کے درس کی یہ ترتیب تھی کہ طالب علم رات کو خود مطالعہ کرے، کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرے، اس کا استنباط و استخراج کرے اور استاد کے سامنے بیان کرے۔میرے دادا استاد مولانا غلام رسول صاحب، جو مولانا غلام رسول صاحب انھی والے کے تلمیذ تھے،فرماتے ہیں کہ میں حمد اللہ کا سبق سنا رہا تھا۔جب میں نے سبق سنا دیا تو حضرت نے کتاب بند کر دی اور فرمایا کہ میری بات سنو۔علامہ غلام رسول صاحب جو کہ استاد تھے، انہوں نے بھی کتاب کے مطالب بیان کیے۔سبق ختم ہو گیا،طلبہ چلے گئے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے جو تقریر فرمائی، وہ بعینہ وہی تقریر ہے جو میں نے کی،صرف اجمال اور تفصیل کا فرق تھا۔آپ نے اس میں اجمالی اور مختصر جملے فرما دیے، میں نے ذرا تفصیل کر دی۔اور تو کوئی فرق نہیں تھا تو آپ نے مجھے یوں کیوں نہ کہا کہ آپ نے اچھا بیان کیا ہے، خوب کیا ہے، دوبارہ تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو حضرت ہنس پڑے اور فرمایا اس لیے تا کہ دوسرے طلبا یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے غلام رسول سے سبق پڑھا ہے، بلکہ یہ ہو کہ استاد سے پڑھا ہے اور تمھارے ذہن میں غرور اور کبر نہ آ جائے، اس لیے دہرا دیا ہے۔تو عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بہت اہم اور نازک مسئلہ ہے کہ آپ اپنے ہونہار اور کامیاب طلبہ کو جو اب استاد ہیں، کیسے سمجھائیں کہ آپ نے کیسے پڑھانا ہے اور اس کا طرز و طریق کیا ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں بعض یونیورسٹیوں میں، کالجوں میں، بڑے مدارس اور جامعات میں جو تربیت گاہیں مقرر کی گئی ہیں، ان کا ہمیں بہت بڑا فائدہ ہے۔ایک شخص اپنے طور پر استاد ہے، مگر اس کے لیے لازم ہے کہ بڑے استاد کے پاس بیٹھ کر علم کی تدریس کے طریقے سیکھے اور پھر اس طریقے کے مطابق پڑھائے۔اس میں گویا علم کی تجدید ہو جاتی ہے اور از سر نو یوں سمجھے کہ مجھے

پڑھانا آیا ہے۔تو میں اس سلسلے کی بڑی تحسین کرتا ہوں اور ان حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جو یہ تقاریب منعقد فرماتے ہیں۔اس سے ہمیں آگے تعلیم کی اور تربیت و اصلاح کی راہ ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل وعلا شانہ اس طریقے کو جاری و ساری فرمائے رکھے۔و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العٰلمین۔

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے
تربیتی نظام کی ضرورت اور تقاضے

ـــــ ڈاکٹر محمود الحسن عارف ـــــ
[صدر شعبہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور]

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی و دیگر معزز علماے کرام و شرکاے سیمینار!

میں سب سے پہلے تو آج کی تقریب کے میز بانوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے مجھ جیسے ایک طالب علم کو علما کی اس مجلس میں مدارس سے تعلق رکھنے والے ایک خصوصی مسئلے پر اظہار خیال کی دعوت دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر زیادہ بہتر تھا کہ دینی مدارس کے کسی استاذ محترم کو اظہار خیال کی دعوت دی جاتی جو اس موضوع پر یقیناً مجھ سے بہتر آپ کی رہنمائی کرتے۔ غالباً میز بانوں کا خیال ہے کہ اس عنوان پر کسی غیر جانب دار مبصر کو اظہار خیال کے لیے کہا جائے، اس لیے ان کی نظر انتخاب مجھ جیسے شخص پر پڑی ہے۔ بایں ہمہ میں کوشش کروں گا کہ مجھے جو ذمہ داری تفویض ہوئی ہے، اس پر ایک غیر جانب دار مبصر کے طور پر روشنی ڈالوں۔

اس سے قبل کہ میں اپنے موضوع پر گفتگو کروں، مناسب خیال کرتا ہوں کہ میں ابتدا ہی میں اپنے اس تجربے کا تذکرہ کروں جو مجھے اپنی ابتدائی زندگی میں دینی مدارس کے ایک طالب علم کے طور پر حاصل ہوا۔ مجھے اس پر فخر ہے کہ میں نے دینی تعلیم دینی مدارس کے ایک باقاعدہ طالب علم کے طور پر حاصل کی ہے۔ میری طالب علمی کا دور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء تک پھیلا ہوا ہے اور ان آٹھ

برسوں میں، میں نے پانچ شہروں میں واقع چھ مدارس سے دینی تعلیم حاصل کی۔ اس وقت وفاق المدارس کا موجودہ سیٹ اپ موجود نہ تھا اور طالب علم تعلیمی درجات اور مراحل کے انتخاب میں کافی حد تک آزاد ہوتا تھا اور آٹھ سال کا کورس چھ یا سات برسوں میں مکمل کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک سال تو فارسی پڑھی اور باقی سالوں میں مدرسہ کاشف العلوم شیخوپورہ، مدرسہ حسینیہ شہداد پور سندھ، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ، دارالعلوم کبیر والا اور جامعہ مدنیہ و جامعہ اشرفیہ لاہور میں درس نظامی کی تکمیل کی اور دورۂ حدیث میں مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور مولانا محمد موسیٰ خان صاحبؒ جیسے اساتذہ کرام سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ اس وقت کے سالانہ امتحان میں مدارس میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی سعادت تک حاصل ہوتی رہی اور راقم الحروف کا شمار ہمیشہ اچھے طلبہ میں ہوتا رہا۔

اس تفصیل سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ آج کے اس سیمینار میں دینی مداس کی تعلیم کے حوالے سے جو کچھ عرض کیا جائے گا، وہ محض سنائی سنائی باتوں پر مبنی نہیں، بلکہ اس میں سے بہت کچھ ''آپ بیتی'' اور ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

دینی مدارس میں تربیتی نظام کی اہمیت و ضرورت

جہاں تک آج کے موضوع کا تعلق ہے تو یہ میرے خیال میں بہت اہم بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی، اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تربیت نام کی شے ابھی تک دینی مدارس کی حدود میں داخل نہیں ہوئی۔ دینی مدارس میں تربیتی نظام نہ ہونے کی بنا پر انداز تدریس اور اسلوب تدریس میں عجیب بوالعجبیاں دیکھنے میں آتی ہیں اور دینی مدارس سے جو طلبہ فارغ ہوتے ہیں، دینی مدارس کے ذمہ دار حضرات انہی میں سے کسی ایک کا، ذاتی تعلق یا کسی سفارش کی بنیاد پر اپنے مدرسہ میں استاذ کی آسامی پر تقرر کر دیتے ہیں اور یہ دیکھنے اور جاننے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے کہ مذکورہ فرد میں پڑھانے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں، اور چونکہ مدارس سے طالب علموں کی جو کھیپ تیار ہو رہی ہے، وہ زیادہ تر ایسے ہی اساتذہ کے ''فیضان علمی'' کا نتیجہ ہے، یہی وجہ ہے کہ دن بدن طالب علموں کا علمی اور فکری معیار گرتا جا رہا ہے اور درس نظامی سے فراغت حاصل

کرنے والے طلبہ کی اکثریت کسی بھی عربی کتاب کو سمجھنا تو درکنار، اس کی عبارت تک پڑھنے سے ناواقف رہتی ہے اور مقابلے کے امتحانات میں معلومات کے فقدان اور نصاب پر گرفت نہ ہونے کی بنا پر اکثر ناکام رہتی ہیں اور اکثر و بیشتر نشانہ تضحیک بنتی ہے۔

دینی تعلیم وتربیت کا پس منظر

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دینی تعلیم وتربیت کا یہ سلسلہ عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تسلسل کے ساتھ کابراً عن کابر چلا آ رہا ہے اور اس میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی انقطاع واقع نہیں ہوا اور اس میں مسلمانوں کی محنت سے زیادہ قرآن حکیم اور اس کے سایے تلے نشو ونما پانے والے علوم وفنون کے اعجازی پہلو کا زیادہ تعلق ہے، اس لیے یقیناً وہ لوگ خوش قسمت اور خوش نصیب ہیں جنہیں ان علوم وفنون کو پڑھنے اور پڑھانے کا موقع ملتا رہا اور جن کے سینے ''یاد یار مہرباں'' سے اور ہونٹ ''ذکر یار'' سے معطر اور منور رہے ہیں اور انہوں نے دشمنوں کی ہزاروں کوششوں اور ہزار کاوشوں کے باوجود اس تعلیم کا پرچم سر بلند رکھا۔ اللہ تعالیٰ علوم اسلامیہ کے ان جاں بازوں پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔

تاہم دینی مدارس کے موجودہ نصاب اور موجودہ نظام تعلیم کا تعلق متاخر مغلیہ دور سے تعلق رکھنے والی ایک قد آور اور بالغ نظر ہستی ملا نظام الدین سہالویؒ (۱۰۸۸۔۱۰۸۹ھ مطابق ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی ذات سے ہے جنہوں نے ایک ایسا جامع اور عمدہ نصاب تعلیم متعارف کروایا جو صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی اسی آب وتاب اور اسی جوش وخروش اور دینی جذبے سے پڑھایا جا رہا ہے۔ اسے دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک نے نئے ''بال و پر'' عطا کیے جو انگریز کے مکمل تسلط، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور ۱۹۳۵ء میں لارڈ میکالے کی طرف سے آنے والی تعلیمی پالیسی کے عملی نفاذ کے بعد سامنے آئی۔ ملا نظام الدین سہالویؒ کا تیار کردہ نصاب تعلیم کا اگر دارالعلوم دیوبند کی علمی اور فکری تحریک کے ذریعے احیا اور اجرا نہ ہوا ہوتا تو شاید یہ نصاب تعلیم ہندوستان کے دوسرے کئی نصاب ہائے تعلیم کی طرح کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ یقیناً اسے دوسری زندگی دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک نے عطا کی ہے۔

نصاب تعلیم کی طرح انداز تدریس بھی صدیوں کی روایت اور قدامت رکھتا ہے اور آج بھی درس نظامی کی کتب کو پڑھانے کا طریقہ اور انداز وہی ہے جو صدیوں پہلے ہندوستان بھر میں خصوصاً اور باقی دنیائے اسلام میں عموماً رائج اور نافذ تھا۔ ابتدائی دور میں چونکہ پڑھانے والے اساتذہ تدریس میں خصوصی مہارت رکھتے تھے اور پڑھنے والے بھی محض ذاتی شوق اور محنت سے پڑھایا کرتے تھے، اس لیے اس وقت اساتذہ کی تربیت نہ ہونے کے باوجود بہت عمدہ طریقے سے کام چل رہا تھا۔ اس وقت استاد اور شاگرد کے مابین تعلق کا جو لازوال رشتہ قائم ہوتا تھا، وہ انہیں ایک دوسرے کے قریب کرتا تھا اور چونکہ طلبہ اپنے اساتذہ کے ساتھ جو وقت گزارتے تھے، اس کے دوران وہ اپنے اساتذہ سے سیکھنے کا عمل جاری رکھتے تھے، اس لیے جب وہ مسند تدریس پر فائز ہوتے تو انہیں کوئی دقت اور دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

دوسرا اہم اور امتیازی فرق یہ تھا کہ اس دور میں علوم آلیہ (صرف ونحو اور منطق) پر شروع میں خوب محنت کرائی جاتی تھی جس کی بنا پر طالب علم کی عربی عبارت اور گریمر پر گرفت مضبوط ہو جاتی تھی۔ اس کے لیے اپنے استاد سے سیکھنے کا عمل بہت بہتر ہوتا تھا۔ مگر اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے اور طالب علم اور استاد میں فاصلے بڑھ گئے ہیں اور اساتذہ کے دروس محض حاشیوں اور شروح تک محدود ہو گئے ہیں۔

جس استاد محترم سے میں نے کافیہ پڑھا، انہوں نے سات دن اس کے پہلے جملے 'الكلمة لفظ وضع لمعنى مفردٌ مفرداً مفردٍ' کی تشریح پر لگائے جس کے دوران انہوں نے کافیہ کی ایک شرح کی پوری باتیں اپنے طالب علموں کے گوش گزار کیں، لیکن ان سات دنوں کی اس تقریر میں شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو اس وقت کے میرے طالب علمانہ ذہن میں بیٹھی ہو۔ اس طرح مختلف کتابوں کے اساتذہ کرام کی کاپیاں کافی مشہور تھیں۔ میرے ایک استاد محترم نے اس وقت (۱۹۷۳ء میں) ہمیں حدیث کی ایک کتاب کے جو نوٹس لکھوائے تھے، برسہا برس گزرنے کے باوجود نہ تو ان کے ان نوٹس کے الفاظ بدلے ہیں اور نہ ہی ان کے معانی ومضامین میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

یہ میرے اساتذہ کرام کی محنت کا ثمر تھا کہ حدیث کی تعلیم کے دوران بھی ہم پر حدیث کا کوئی رنگ نہیں چڑھا اور ہم بخاری، مسلم اور ترمذی کے درسوں میں بھی قدوری، ہدایہ اور نورالانوار کا مزہ لیتے رہے اور مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ چند ایک اساتذہ کرام کے سوا کسی ایک استاد نے کتاب کے مصنف کا یا ان کے حالات کا ذکر کیا ہو اور یہ بتایا ہو کہ یہ کتاب کس دور میں لکھی یا تصنیف کی گئی۔ بعض اساتذہ گھنٹہ بھر کی تدریس کے بعد جب درس گاہ سے رخصت ہوتے تو ہمارا ذہن کورے کاغذ کی طرح خالی اور صاف ہوتا اور ہمیں ان کی لچھے دار تقریروں میں سوائے دو چار جملوں کے کچھ بھی یاد نہ رہتا تھا۔ پھر علامہ تفتازانی اور جرجانی کے حاشیہ در حاشیوں کا مسئلہ اس پر مستزاد ہے جن کی اٹھائی ہوئی منطقی موشگافیوں سے ذہن تو یقیناً تیز ہوتا ہے، مگر طالب علم کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور مجبوراً امتحان کے وقت دوسرے لوگوں کی تیار کردہ کاپیوں یا نوٹس کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب سے وفاق المدارس کا نظام قائم ہوا ہے، اس وقت سے تو یہ کاپیاں اور یہ نوٹس ایک بین الملکی شے بن گئے ہیں اور طالب علموں کے لیے Guess paper کا سا درجہ رکھتے ہیں۔

دراصل ہر مضمون کو اس کے اپنے ماحول میں مطالعہ کرنے اور پڑھانے کی ضرورت ہے۔ اگر دینیات کو منطق کے رنگ میں یا حدیث کو فقہ کے انداز میں پڑھایا جائے تو اس سے اس مضمون کی افادیت ختم ہو جاتی ہے اور پڑھنے والا آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے ان رویوں پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ حالات اور ہمارے دینی مدارس سے تیار ہونے والی علما کی کھیپ اور ان کا معیارِ علمی اور معیارِ تعلیمی، دینی مدارس کے زعما کے لیے بہت بڑا لمحہ فکریہ ہے جس کی بنا پر مذہب کی دنیا میں بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دے رہی ہیں اور ہمیں شاید ابھی تک اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کا احساس نہیں ہے۔ یہ محض تصویر کا وہ رخ ہے جو شاید ہمارے سامنے نہیں ہے یا جس کی طرف سے ہم نے اپنی آنکھیں عملاً بند کر رکھی ہیں اور ہم کسی بھلے وقت کا انتظار کر رہے ہیں جو شاید کبھی نہیں آئے گا اور ہمیں وہی کچھ ملے گا جو اہم اپنی ان نسلوں کے ذہنوں میں بو رہے ہیں۔

پس چہ باید کرد

اب سوال یہ ہے کہ دینی مدارس کے معیار تعلیم، وہاں سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں کی بالغ نظری اور انہیں وقت اور زمانے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنا سکھانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس حوالے سے اب یہ بات ناگزیر ہوگئی ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی مناسب وموزوں تربیت کا بھی انتظام اور اہتمام ہونا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں یہ بات عملاً تسلیم کر لی گئی ہے کہ دوسروں کو پڑھانا یا تعلیم دینا یہ ایک الگ اور مستقل فن ہے اور یہ بات ضروری نہیں ہے کہ ایک اچھا عالم ایک اچھا استاد بھی ہو اور یہ فن بھی تعلیم وتعلم کا محتاج ہے۔ خود لفظ تعلیم میں اس عملی پہلو کی طرف رہنمائی پائی جاتی ہے۔ نامور ماہر لغات علامہ راغب الاصفہانی نے لفظ تعلیم کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

والتعليم اختص بما يكون بتكرير وتكثير حتى يحصل منه اثر فی نفس المتعلم وقال بعضهم التعليم تنبيه النفس لتصور ذالك

(الراغب الاصفہانی، مفردات فی غریب القرآن، ص۳، بذیل مادہ علم)

''تعلیم کسی شے کو دہرانے اور کثرت کے ساتھ اس کے تکرار کا نام ہے، تا آنکہ اس کا اثر طالب علم کے نفس پر ظاہر ہو جائے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ تعلیم اس کے تصور کے لیے نفس کو متنبہ اور آگاہ کرنے کا نام ہے۔''

تعلیم کی اس لغوی تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ تعلیم بذات خود ایک الگ اور مستقل فن ہے جو سیکھنے سکھانے کا محتاج ہے۔ جبکہ تربیت کا مادہ ''رب'' ہے جو کہ مصدر ہے۔ علامہ راغب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

الرب فی الاصل التربية هو انشاء الشئ حالا فحالا الى التمام يقال ربه ورباه ورببه فالرب مصدر مستعار للفاعل

(ایضاً، ص۱۸۹، بذیل مادہ رب)

''الرب کے لغوی معنی ''تربیت'' کے ہیں، یعنی کسی شے کو درجہ بدرجہ کمال تک پہنچانا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: 'ربہ و رباہ و ربیہ'۔ اس طرح 'الرب' لغوی لحاظ سے مصدر ہے جو فاعل (تربیت کرنے والے) کے مفہوم میں مستعار لیا گیا ہے۔''

اور اگر جدید علم التعلیم کے حوالے سے بات کی جائے تو فن تعلیم یا فن تدریس سے مراد نصاب کو موثر انداز میں طلبہ تک پہنچانے کے لیے موثر حکمت عملی کو اپنانے کا نام ہے۔ اس کے لیے اصول نفسیات اور طرق تدریس کا صحیح فہم ہونا بھی ضروری ہے۔ نظام تعلیم کا یہ پہلو اطلاقی و عملی حیثیت رکھتا ہے۔

مزید برآں آج کل تعلیم وتدریس کو کسی ایک طریقے تک محدود نہیں سمجھا جاتا، بلکہ دور حاضر میں تعلیم اور تدریس کے بیسیوں طریقے ہیں جو طالب علم اور طالب علموں کے رویے اور ان کی ذہنی سطح اور ان کے فکری افق کو سامنے رکھ کر اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے خود استاد یا معلم کی تربیت کا ہونا ضروری ہے۔ پھر جس طرح علم کی تحصیل' محنت کے علاوہ اساتذہ کی طرف سے مناسب رہنمائی کی محتاج ہے، اس طرح ''تربیت معلم'' کے لیے طالب علم میں مناسب وموزوں اہلیت کا ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی طرف سے مناسب رہنمائی کا ملنا بھی ضروری ہے۔

اب آیئے، ہم دیکھیں کہ دینی مدارس کے اساتذہ کی کن کن پہلوؤں پر رہنمائی یا تربیت ضروری ہے۔

ا۔ مقاصد

دنیا میں جس طرح علوم وفنون میں تنوع اور رنگا رنگی ہے، اسی طرح تدریسی مناہج اور تعلیمی طریقوں میں بھی بڑا تنوع پایا جاتا ہے اور مقاصد تعلیم کو سامنے رکھ کر تعلیم کا منہج اور تدریس کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر مختلف قومیں اور مختلف ممالک اپنی تعلیمی پالیسیاں جاری کرتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں تعلیمی مقاصد پر کوئی توجہ اور کوئی دھیان نہیں دیا جا رہا۔ اس میں شک نہیں کہ دینی مدارس میں تعلیم کا سب سے بڑا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے اور یہ مقصد بذات خود بڑا مقصد ہے، لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ضمنی اور جزوی

مقاصد کا تعین بہر حال ضروری ہے۔

تعلیمی مقاصد کا تعین اور ان کے مطابق تعلیمی انداز اور منہج کا اختیار کرنا اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ اب دنیا کا ماحول بہت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور ایک استاد کو اس بات کا احساس اور ادراک ہونا ضروری ہے کہ اسے کس ماحول میں اور کس انداز سے اپنی بات کہنی ہے۔

۲۔ تعلیم کے جدید طریقے

پھر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ہمارے دینی مدارس میں زیادہ تر، تدریس کا ایک ہی طریقہ رائج اور نافذ ہے جسے درسی کتب کا طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ اس طریقے میں استاد خود درسی کتاب سے کچھ حصہ پڑھتا ہے یا کسی طالب علم سے پڑھواتا ہے اور پھر استاد عبارت کے مشکل مقامات کی تشریح کرتا جاتا ہے اور حسب ضرورت طلبہ سوالات کے ذریعے بھی اپنی مشکلات حل کرتے ہیں۔

تعلیم اور تدریس کا یہ طریقہ اتنا فرسودہ ہو چکا ہے کہ اس سے نہ تو طالب علم میں کوئی علمی مہارت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی استاد کی علمی اور فکری صلاحیتوں میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس انداز تعلیم سے کلاس کے صرف ذہین طلبہ ہی مستفید ہو سکتے ہیں اور ایسے طلبہ جن کا ذہنی اور فکری مستویٰ مختلف ہو، یہ طریقہ تدریس ان کے لیے چنداں فائدہ مند نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس عصر حاضر میں تعلیم ایک ''فن'' اور ایک ''سائنس'' بن گیا ہے اور طالب علموں کو مضمون پڑھانے کے لیے بیسیوں طریقے ایجاد کیے جا چکے ہیں جن میں سمعی اور بصری ذرائع اور وسائل کو اختیار کر کے طالب علموں کے لیے حصول علم میں آسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہر مضمون اور ہر ایک (Subject) کو پڑھانے کا مستقل طریقہ یا طریقے ایجاد کر لیے گئے ہیں، اور جو مضمون جتنا اہم ہوتا ہے، اتنا ہی اسے آسان اور سہل طریقے سے پڑھانے کا طریقہ اپنایا جاتا ہے۔ اس حوالے سے عربی صرف ونحو، حدیث، فقہ اور قرآن مجید کی تدریس کے آسان اور سہل طریقے اختیار کرنا وقت کی سب سے اہم اور سب سے بڑی ضرورت ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ طریقہ ہائے تدریس میں وسعت اور تنوع سب سے پہلے مسلمان علما کے ہاں پیدا ہوا جس کے لیے صحیح بخاری کی کتاب العلم کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں

مسلمانوں کے ہاں اس بارے میں پائی جانے والی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۔ طلبہ میں نظم ونسق کا مسئلہ

اس سلسلے میں سب سے خراب صورت حال طلبہ کے ساتھ معاملات کی ہے۔ دینی مدارس میں طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا رویہ اور ان کا معاملہ بے حد افسوس ناک حیثیت رکھتا ہے۔ عام طور پر دینی مدارس میں طلبہ کی وہی حیثیت ہے جو جاگیرداروں اور وڈیروں کے ہاں ان کے مزارعوں اور نوکروں کی ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ دینی مدارس میں طلبہ کے کوئی آئینی حقوق نہیں ہیں۔

اسباق کے دوران طلبہ کو زیادہ سوالات پوچھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے قدوری کے سبق میں اپنے استاد سے یہ پوچھا تھا کہ اگر نماز کے دوران میں نمازی کو ایک سے زیادہ مرتبہ سہو ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو میرے استاد محترم نے جواب دیا تھا کہ ''تم مودودی کی طرح خواہ مخواہ کے سوال نہ اٹھایا کرو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اس کا مزید جواب دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بعض اساتذہ سوال پوچھنے پر اپنی درس گاہ سے طالب علم کو نکال دیتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے ہاں دینی مدارس میں طلبہ کی ذہنی استعداد بڑھانے اور اس بارے میں ان کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان کے اندر موجود علمی اور فکری صلاحیتوں کو کچلنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں مدارس میں طالب علموں کا گلا گھونٹنے کا قدم قدم پر بندوبست ہوتا ہے تاکہ ان کے اندر سے ''لا الہ الا اللہ'' کی کوئی آواز بلند نہ ہو سکے۔ یہ طالب علم انتہائی خوف کے عالم میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مدارس کی انتظامیہ ہر ممکن طریقے سے طالب علموں کی تذلیل گوارا اور روا رکھتی ہے۔ سب سے زیادہ دکھ ذہنی اور فکری تذلیل کا ہے جس کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ ان رویوں اور طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

چونکہ دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے زیادہ تر طلبہ کا تعلق پس ماندہ علاقوں اور پس ماندہ خاندانوں سے ہوتا ہے، اس لیے وہ اس گھٹے ہوئے اور تذلیل وتحقیر کے ماحول کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں، لیکن ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا یہ رویہ ان کے اندر موجود ان کی ذہنی اور

فکری صلاحیتوں کے خاتمے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ احیا و اشاعت دین کا کام کریں گے، احمقانہ سی بات ہے۔

موجودہ زمانے میں طلبہ سے ڈیلنگ بھی ایک مستقل فن اور ایک مستقل علم بن چکا ہے اور اس کے لیے بھی اساتذہ کی بھرپور توجہ کی ضرورت ہے۔

مختصراً یہ کہ:

۱۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں اساتذہ کی تربیت کا کوئی معقول نظام اپنایا جائے۔

۲۔ یہ کام وفاق المدارس کی سطح پر بھی کیا جا سکتا ہے اور مختلف مدارس کی سطح پر بھی۔

۳۔ جن مضامین اور موضوعات میں انہیں تربیت کی ضرورت ہے اور جن جن طریقوں سے انہیں تربیت مہیا کی جا سکتی ہے، ان کا تعین باہم مشاورت سے کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ آئندہ کے لیے ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ دینی مدارس میں بطور استاد ہونے والی نئی بھرتی میں انہی تربیت یافتہ اساتذہ کو موقع دیا جائے۔ اس سے دینی مدارس کی تعلیم میں بہتری آئے گی اور طالب علم کے ذہنی افق میں اضافہ ہوگا۔

فضلاے مدارس کے علمی وروحانی معیار کا مسئلہ

ـــــ مولانا عبدالحق خان بشیر ـــــ
[جنرل سیکرٹری پاکستان شریعت کونسل، پنجاب]

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم۔ اما بعد!

صدر گرامی قدر، معزز علماے کرام!

اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں یہ نشست منعقد کی گئی ہے۔ اگر چہ میں تدریس کی لائن کا آدمی نہیں ہوں، لیکن چونکہ مدارس کے اندر وقت گزارا ہے، اس لیے چند باتیں عرض کروں گا۔

ایک مسئلہ ہے نصاب میں تبدیلی کا تو جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، حضرت شیخ الہندؒ اور امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے دور سے نصاب میں تبدیلی کی ضرورت بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے اور اپنے طور پر کوششیں بھی ہوئی ہے کہ اس نصاب میں کچھ ایسی ترامیم کی جائیں جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں آتا ہے کہ بحری سفر کے دوران ایک جرمن سے ان کی گفتگو ہوئی۔ وہ انگلش جانتا تھا، عربی نہیں جانتا تھا۔ حضرت نانوتویؒ عربی جانتے تھے، انگلش نہیں جانتے تھے۔ درمیان میں ترجمان مقرر کرنا پڑا تو اس وقت حضرت نانوتویؒ نے ارادہ ظاہر کیا کہ واپسی پر میں سب سے پہلے انگلش سیکھوں گا۔ گویا حضرت نانوتویؒ نے اس بات کا اشارہ دیا کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق علما کے لیے انگلش کا جاننا بھی ضروری ہے۔ حضرت امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے تو اس کی

طرف خصوصی توجہ دی۔ حضرت سندھیؒ کا موقف یہ تھا کہ ہمارے نصاب کے اندر امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کتابوں کو خاص اہمیت دی جانی چاہیے، کیونکہ ان کتابوں کے اندر وقت کے تقاضوں کے مطابق وہ تمام چیزیں موجود ہیں جن کی آگے علما کو ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ نصاب کا ہے۔ اس کے بعد بڑا مسئلہ نظام کا ہے، لیکن وہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع ''دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی تربیت اور اس کے تقاضے'' ہے کہ اساتذہ جو ہمارے دینی مدارس میں پڑھانے کے لیے مقرر ہیں، کیا وہ اپنا حق ادا کر رہے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اپنا حق ادا کر رہے ہوتے تو آج قحط الرجال کا دور نہ ہوتا۔ ہمیں ایک مدرس کی ضرورت ہوتی ہے تو ہمیں بیسیوں مدارس سے رابطہ کرنا پڑتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہر سال ہزاروں علما فارغ التحصیل ہوتے ہیں، پھر بھی ان میں سے تدریس کے منصب پر بیٹھنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور ہمیں ان کی تلاش کرنا پڑتی ہے۔ اور اب تو حالت یہ ہے کہ اوپر میز پر استاد نے کتاب کھولی ہوتی ہے اور نیچے دراز میں شرح کھولی ہوتی ہے۔ کبھی کتاب کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی شرح کی طرف دیکھتا ہے اور سبق پڑھاتا ہے۔ ایسے استاد سے کوئی شاگرد اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوال کا اظہار کرے گا تو اسے ڈانٹ نہیں پڑے گی تو اور کیا ہوگا؟ اس کیفیت میں نہ وہ شاگرد اپنے استاد سے استفادہ کر سکتا ہے اور نہ استاد ہی اپنا فیض اسے منتقل کر سکتا ہے۔

کسی بھی استاد کے لیے سب سے بنیادی اور ضروری بات یہ ہوتی ہے کہ وہ طلبا کی نفسیات کو سمجھتا ہو۔ جو استاد طلبا کی نفسیات سے واقف نہ ہو، وہ صحیح طور پر تعلیم نہیں دے سکتا۔ استاد کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری کلاس کا فلاں طالب علم کتنی استعداد کا مالک ہے، اس میں کس قدر صلاحیتیں ہیں، اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ میں نے محدث کبیر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کاشمیریؒ کے بارے میں پڑھا ہے کہ حضرت کبھی اپنے طلبہ کا امتحان نہیں لیتے تھے۔ ان کو اپنی کلاس کے ایک ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کا پتہ ہوتا تھا، حالانکہ ان کی کلاس میں سینکڑوں طلبہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب امتحان کا وقت آتا، علامہ کاشمیریؒ رجسٹر دیکھتے اور امتحان لیے بغیر وہیں بیٹھ کر نمبر لگا

دیتے تھے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس طالب علم کی استعداد کیا ہے اور اس کی نفسیات کیا ہے۔

چونکہ دینی تعلیم کا تمام تر انحصار روحانیت پر ہے، اس لیے دینی تعلیم کا حق وہی مدرس صحیح طور پر ادا کر سکتا ہے جس میں روحانیت، خشیت اور اخلاص پورے طور پر موجود ہے۔ اور اگر کوئی مدرس روحانیت سے خالی ہے تو چاہے وہ کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو، وہ دینی تعلیم کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس سے مجھے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ حضرت سے کسی نے پوچھا کہ جب آپ بیان کرتے ہیں تو عجیب وغریب نکات بیان کرتے ہیں۔ آپ نے کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ تو حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں نے تین کتابیں پڑھی ہیں، انہی کتابوں کا فیض میرے اندر موجود ہے۔ ان میں سے پہلی کتاب کا نام ہے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، دوسری کا نام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، اور تیسری کتاب کا نام مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ ان چلتی پھرتی کتابوں کے فیض یافتہ تھے اور اگر تعلیم کا تعلق پریکٹیکل کے ساتھ ہے تو استاد کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ طلبا اپنے استاد کے صرف الفاظ پر نہیں بلکہ طرز عمل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ہم اپنے دینی مدارس میں اس بات کا رونا روتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم کی کوتاہیاں ہمیں مسلسل زوال کی طرف لے کر جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس خانقاہی نظام سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمیں اپنے خانقاہی مدارس سے ہی روحانیت ملتی تھی، ہمارا تزکیہ ہوتا تھا، ہم میں خلوص اور للّٰہیت پیدا ہوتی تھی، لیکن خانقاہی مدارس کے ختم ہونے کے بعد اب اگرچہ ممکن ہے کہ ہمیں اچھا بخاری شریف پڑھانے والا مل جائے، اچھا مسلم شریف پڑھانے والا مل جائے، اچھا جامی و کافیہ پڑھانے والا مل جائے، لیکن ایسا مدرس جو طلبا کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہو، ایسے مدرس ہمارے ہاں بہت کم ہیں، اس لیے کہ ہمارے مدارس میں روحانی تربیت باقی نہیں رہی۔ تو نصاب کی وجہ سے علمی طور پر زوال تو آ ہی رہا تھا، اب خانقاہی تربیت نہ ہونے کی وجہ سے روحانی زوال بھی آ رہا ہے۔

معلم کا منصب اور اس کے فنی و اخلاقی تقاضے

مولانا عبدالرؤف فاروقی
[مہتمم جامعہ اسلامیہ، کامونکی]

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم اما بعد فاعوذ بالله من الشیطن الرجیم بسم الله الرحمن الرحیم اقرا باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق اقرا وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم

میں نے جو آیات مبارکہ پڑھی ہیں، ان میں کہا گیا ہے: اقرا وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔ تعلیم بالقلم، یہ طریقہ تدریس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود کو جب معلم کہا ہے کہ میں نے تعلیم دی ہے تو یہ کہا کہ بالقلم، ایک واسطہ اور سبب استعمال کیا ہے اور وہ قلم ہے۔ چنانچہ مدرسین کو چاہیے کہ اپنے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ علم دینے کے لیے ان مفید ذرائع کو استعمال کریں اور اپنے مدرسے کے منتظمین سے یہ درخواست کریں کہ میں اپنے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ مستفید کرنا چاہتا ہوں، مجھے یہ چیزیں مہیا کی جائیں۔ پہلے بلیک بورڈ ہوا کرتا تھا، اس پر چاک کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ اب وائٹ بورڈ آ گیا ہے، اس پر مارکر کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ بڑے آسان طریقے آ گئے ہیں تو اگر اس کو استعمال کرنے کی تھوڑی سی مشق کر لی جائے تو اس پر کوئی اسکول و کالج کی اجارہ داری نہیں ہے کہ وہ استعمال کر سکتے ہیں اور ہم نہیں، یا وہاں اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے، یہاں نہیں۔ آپ صرف و نحو پڑھا رہے ہیں، آپ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا

رہے ہیں، آپ حدیث مبارکہ پڑھا رہے ہیں، اس کے لیے وہ چیز جو سمجھ میں نہیں آ رہی، اس کو اگر آپ وائٹ بورڈ کے ذریعے اپنے طلبہ کو سمجھانے کی کوشش کریں یا کسی کو سمجھاتے ہوئے دیکھ لیں تو آپ کو خود بخود ان شاء اللہ اس کا طریقہ آ جائے گا۔ اس کا استعمال طریقہ تدریس میں اور تربیتی کام میں ضروری ہے۔

جب ہم پڑھتے تھے تو اس وقت ایک درجے میں دس پندرہ طلبہ ہوا کرتے تھے۔ اب ایک درجے میں ڈیڑھ سو تک طلبہ ہوتے ہیں، یعنی مدارس بھی بڑھے ہیں اور مدارس میں طلبہ کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ ایک استاذ ایک گھنٹے میں ڈیڑھ سو طلبہ کی نفسیات کے ساتھ کس طرح نباہ کرے گا؟ جامعہ اشرفیہ میں جب میں پڑھتا تھا تو ایک درجے میں بارہ، تیرہ طلبہ تھے۔ اب وہاں میرا بیٹا پڑھتا ہے، اس کے درجے میں طلبہ کی تعداد ۱۴۵ ہے۔ استاذ کا تعلق اپنے طلبہ کے ساتھ صرف پون گھنٹے کا ہے، اپنے فن کے اعتبار سے۔ اس کے بعد استاذ چور دروازے سے اپنے گھر چلا جاتا ہے اور طالب علم اپنے ہاسٹل اور دارالاقامہ میں چلا جاتا ہے۔ باقی چوبیس گھنٹے طلبہ کا اپنے اساتذہ کے ساتھ ربط ضبط نہیں ہوتا۔ اب ایک استاذ ڈیڑھ سو طلبہ کی نفسیات کا کیسے مطالعہ کرے گا اور وہ کیسے ان کی نفسیات سے واقف ہوگا؟ اس لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم چالیس چالیس طلبہ کی کلاسیں بنالیں، ایک ہی درجے کے چار پانچ فریق بنا لیے جائیں۔ اس طرح استاذ کو اپنے ہر ایک طالب علم کی نفسیات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی اور وہ ہر ایک پر ذاتی توجہ دے سکے گا۔ جب کلاس کم ہوگی تو آپ دھیان رکھ سکیں گے کہ کون متوجہ ہے اور کون متوجہ نہیں ہے، کون جاگ رہا ہے اور کون بین النوم والیقظۃ ہے۔ ہمارا آٹھ سال کا جو دورانیہ ہے، اس میں تعلیم تو روزانہ چھ گھنٹے ہوتی ہے۔ ان چھ گھنٹوں میں میرا خیال ہے کہ اکثر طلبہ دو گھنٹے جاگ کر اور چار گھنٹے سو کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اساتذہ کو یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ اس قطار کے پیچھے جو حضرات ہیں، وہ کیا کر رہے ہیں۔ رقعہ بازی ہو رہی ہے یا کتاب کھولی ہوئی ہے اور اپنے گھر والوں کو خط لکھ رہا ہے۔ لیکن اگر طلبہ کی تعداد کم ہوگی تو استاذ ہر ایک طالب علم کے تمام معاملات کو دیکھ رہا ہوگا۔ تو آپ اس بات کا بھی اہتمام فرمائیں۔

آپ مدرس ہیں یا مدرس بننے جا رہے ہیں تو آج آپ یہ طے کریں کہ جب میں مدرس بنوں گا تو اپنے شاگرد کے علم وفن، اس کی اخلاقی تربیت اور اس کے مدرسے کے جو مسائل ہیں، ان میں وہ میری اولاد کی طرح ہے۔ جس طرح گھر میں آپ کو چار پانچ بچوں کی تمام ضروریات پوری کرنا ہوتی ہیں، اسی طرح مجھے اپنے طلبہ کی تمام ضروریات پوری کرنا ہیں۔ ایک باپ کی حیثیت سے اپنی کلاس کو دیکھیں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایک کامیاب معلم ہیں۔

تکرار کا ہمارے ہاں جو ماحول تھا، وہ اب آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ جو کہا گیا ہے کہ اذا تکرر الکلام علی السمع تقرر فی القلب، ایک پون گھنٹے میں جتنا سبق ہمیں پڑھایا جاتا تھا، دس منٹ میں پڑھا کر فارغ کر دیا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ باقی آدھا گھنٹہ فارغ رہتا ہے۔ اگر وہ آدھا گھنٹہ فارغ نہ رہے، ایک استاذ کو چالیس پینتالیس منٹ کا جو وقت دیا گیا ہے، اگر وہی پون گھنٹہ استاذ اس سبق کو بار بار دہرائے اور طلبہ سے بھی اس کا اعادہ کروائے تو تکرار کی ضرورت ہی نہیں رہے گی اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس انگریزی سیکھنے کے لیے یا کمپیوٹر سیکھنے کے لیے یا کسی اور کام کے لیے وقت نہیں بچتا تو اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ جتنا کام کسی فن کا ہم چوبیس گھنٹے میں کرتے ہیں، وہ چالیس منٹ میں ہو سکتا ہے اگر ہم کلاس کی جتنی ضروریات ہیں، ان کو پورا کر دیں۔ ایک مدرس ہونے کی حیثیت سے آپ اس کا تجربہ کریں شروع میں کتاب کے متعلق جو بنیاد بن جاتی ہے وہ آخر تک قائم رہتی ہے۔ منتظمین کی طرف سے آپ کو جو چالیس، پینتالیس منٹ کا پیریڈ دیا گیا ہے، آپ اس کا استعمال اس طرح کریں کہ آپ سبق پڑھائیں تو پھر دوبارہ اس کا اعادہ کریں اور دو تین دفعہ دو تین طلبہ سے سنیں۔ کبھی کسی سے، کبھی کسی سے، تو ہر طالب علم اپنا سبق چوکنا ہو کر سنے گا۔ اب تو ایسے اسکول آ گئے ہیں جو کہتے ہیں کہ بستہ بھی گھر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ بستہ یہاں رہے، بچہ صبح اسکول آئے اور شام کو گھر چلا جائے۔ گھر کا جتنا کام ہے، ہم اس کو یہاں کرائیں گے۔ باقی وقت وہ ٹی وی دیکھتا ہے، کھیلتا کودتا ہے۔ تو اگر ہم جدید طریقہ ہائے تدریس سے کچھ استفادہ کریں تو ہمارے بچوں کے پاس بہت سا وقت بچ سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کو اپنے آپ پر مسلط کر لیں۔

طریقہ تدریس میں ہمارے ہاں تکرار اور مطالعے کا جو ماحول ہے، اس کے بارے میں ہمارے اساتذہ ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ بغیر مطالعہ کے سبق پڑھانا تو زنا کرنے کے برابر ہے۔ یہ جملہ ہمارے ہاں چلتا ہے کہ یہ ایسے ہی کتاب کے ساتھ ظلم اور طالب علم کے ساتھ ناانصافی ہے جیسے ایک آدمی نے ایک بہت بڑے کبیرہ گناہ زنا کا ارتکاب کرلیا ہے۔ طالب علم کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مطالعہ کر کے آئے۔ پھر استاذ کا علم اور طالب علم کا علم، یعنی علم اور طلب علم جب آپس میں ملیں گے تو کام بنے گا۔

اس کے ساتھ ساتھ بات ہے علم کو سینوں میں اتارنے کی۔ اور تدریس کے طریقے کے لیے تو وہی پرانا معاملہ ہے کہ دن کو آپ گھوڑے کی پیٹھ پر ہوں اور رات کو مصلے پر کھڑے ہوں۔ کہا گیا ہے کہ 'ان للتقویٰ مهابة'، تقویٰ کا اپنا ایک رعب ہے۔ اور علم کے بارے میں مجھے میرے شیخ حضرت عبید اللہ انورؒ نے کئی دفعہ یہ بات سنائی، مولانا زاہد الراشدی بھی اس کے گواہ ہوں گے کہ حضرت مدنی فرمایا کرتے تھے کہ تسخیر کائنات کا سب سے بڑا وظیفہ تقویٰ ہے۔ آپ جتنے زیادہ متقی ہوں گے، کائنات اتنی آپ کے سامنے مسخر کر دی جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ آپ کو مجتہد فی التدریس بنا دیں گے، شرط یہ ہے کہ آپ کا اپنا ذوق، اپنا اخلاص یہ ہو کہ میں جو کچھ بنا ہوں، میرا شاگرد مجھ سے بھی اونچی جگہ پر پہنچے۔ یہ تو دنیا کا نظام ہے۔ ہر باپ یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے آگے بڑھ جائے، تو جب آپ باپ کے درجے پر آئیں گے اور شاگرد کے بارے میں یہ سمجھیں گے کہ میں باپ ہوں اور یہ میرا بیٹا ہے تو آپ کی یہ خواہش ہوگی کہ آج میں جس جگہ پر بیٹھا ہوں، میرا شاگرد مجھ سے بھی آگے بڑھے اور دنیا میں اس کے علم کا فیضان ہو۔ یہ میرا ایک صدقہ جاریہ ہے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب ایسا جذبہ ہوگا، یہ اخلاص ہوگا تو اللہ تعالیٰ آپ کے لیے تدریس کے طریقوں میں خود مجتہدانہ صلاحیت پیدا کر دے گا۔ روزانہ نئے سے نئے طریقے سمجھ میں آتے رہیں گے۔ ان سے آپ اپنا علم آگے پہنچاتے رہیں گے۔

مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ برصغیر کے سب سے بڑے اردو کے خطیب تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ پیر مہر علی شاہ صاحبؒ سے بیعت ہوئے اور پھر بعد میں حضرت رائے پوریؒ

سے بیعت ہوئے۔ پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے پاس بیعت کے لیے جانے سے پہلے وہ میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے پاس گئے کہ مجھے بیعت کر لیں۔ (تو یہ ہمارا ایک اور بھی مسئلہ ہے کہ ہم نے اپنے مشائخ کو ان کے کھاتے میں ڈال دیا ہے جو کبھی مشائخ کے مزاج کے تھے ہی نہیں) تو کہتے ہیں کہ میاں صاحب نے کہا کہ ''شاہ جی، تہاڈا حصہ میرے کول نہیں ہے۔ میرے کول ہوندا تے میں تہانوں گھڑ دیندا''۔ گھڑ دینے کا مفہوم آپ کے ذہن میں ہے، ایک غیر متوازن چیز کو متوازن بنا دینا۔ یہ ہوتا ہے اصل میں استاد کا کام۔ امیر شریعت کا حصہ یہاں نہیں تھا تو پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے پاس چلے گئے۔ وہاں بیعت ہوئے تو پیر مہر علی شاہ صاحبؒ کے بعد ان کے خاندان میں وہی صاحبزادگی تھی۔ وہاں مزاج نہ بن سکا تو حضرت رائے پوریؒ کے پاس آئے تو حضرت رائے پوریؒ نے بہر حال گھڑا۔ آپ اگر امیر شریعت کی صرف خطابت نہیں، ان کی وہ زندگی جو تربیت کی زندگی ہے کہ انہوں نے کس طرح اللہ اللہ کرنا سیکھا ہے، وہ کبھی معلوم کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کس طرح وہ گھڑا کرتے ہیں۔

آپ کے پاس والدین ایک سرکش بچہ، ان گھڑا بچہ، غیر متوازن بچہ، اپنی بہت بڑی متاع آپ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کو گھڑنا، سنوارنا اور زمانے کا معلم بنانا یہ آپ کی ذمہ داری ہے، اور یہ تبھی ہوگا جب ہم اس بچے کے اوقات کو اور اس بچے کی زندگی کو اپنے پاس امانت سمجھیں گے اور کل قیامت کے دن 'لاایمان لمن لا امانة له و لادین لمن لا عهد له' کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دہی کے احساس کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو انجام دیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے اور آپ کو اپنے پیغمبر کے طریقہ تدریس کی روشنی میں اپنے زمانے کا معلم بننے کی توفیق عنایت فرمائے اور جو لوگ ہمارے پاس علم سیکھنے کے لیے اور فیضان کی روشنی لینے کے لیے آتے ہیں، ہم ان کو زمانے کا معلم بنا سکیں۔ وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ جیسے وہ ''سراج منیر'' تھا اور اس نے صحابہ کو ''نجوم'' بنا دیا، ہم بھی اپنے طلبہ کو آئندہ کی نسلوں کے لیے اسی طرح تیار کریں تو ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

تعلیم وتعلم میں اخلاص نیت کی اہمیت

ــــ مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی ــــ
[مہتمم مدرسہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ]

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

محترم حاضرین، برادران اسلام واساتذہ کرام!

آج کی یہ تربیتی محفل آپ صبح سے سماعت فرما رہے ہیں اور یہ اس کی دوسری نشست ہے۔ اس میں بہت سے اہل علم وفضل کی تقاریر آپ نے سنیں، تجاویز اور آرا آپ کے سامنے آئیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں پر جن مقررین نے خطاب کیا ہے، انہوں نے دینی تعلیم کے علاوہ عصری تعلیم کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ یہ مجلس چونکہ دینی مدارس کے اساتذہ کرام کی ورک شاپ کے سلسلے میں ہے، یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہم عصری تعلیم کی اہمیت کو بھی اپنی جگہ ملحوظ رکھتے ہیں اور اگر دونوں پہلوؤں پر بات کرنی ہے تو پھر میری ناقص رائے کے مطابق اس میں ایسے مقررین کو بلانا چاہیے جو دینی مدارس کی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم سے بھی بہرہ ور ہوں۔ کیونکہ ہمارے ہاں جن مقررین نے تقریر کی ہے، ان میں سے بعض نے کہا کہ میرا دینی مدارس کے ساتھ تعلق نہیں اور بعض نے کہا کہ میرا تعلق صرف دنیاوی تعلیم سے ہے، جبکہ اگر دونوں پہلوؤں پر یکساں تبصرہ کرنا ہے تو ایسی شخصیات کو دعوت دینی چاہیے جن کی دونوں پہلوؤں پر نظر ہو تاکہ ان کے سامنے صرف کالج اور یونیورسٹی کا ماحول نہ ہو یا ان کے سامنے صرف دینی مدرسہ اور

مکتب کا ماحول نہ ہو۔ دونوں ہوں تو پھر وہ ایک جامع تبصرہ کر سکتے ہیں۔ اگر صرف ایک پہلو ہوگا تو وہ اپنے متعلق خوبیاں یا خامیاں بیان کر سکتے ہیں، لیکن دوسرے پہلو پر وہ کچھ عرض نہیں کر سکتے۔ اس حوالے سے یہ میری ایک سفارش ہے۔

باقی جن حضرات نے یہاں پر تقاریر کی ہیں اور اپنی تجاویز دی ہیں، ان کو کئی پہلوؤں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ میں اس کے صرف ایک پہلو پر اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ تمام پہلو جن میں ہم علم کو، تربیت کو، اخلاق کو اور ارتقا کو تقسیم کرتے ہیں، یہ تمام پہلو اسی وقت ٹھیک ہو سکتے ہیں جب کسی انسان کی نیت ٹھیک ہوگی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'انما الاعمال بالنیات'۔ اگر ایک آدمی باعمل ہے تو جب اس کی نیت ٹھیک ہوگی، اس کے ساتھ اخلاص ہوگا، باقی چیزیں ہوں گی تو پھر وہ آدمی کامیاب ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ایک آدمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے تو چاہے وہ اپنے فن کا کتنا ہی ماہر ہو، اس کا فیض عام نہیں ہو سکتا۔ اس کے پاس وسیع معلومات تو ہیں، لیکن نیت ٹھیک نہیں ہے، اخلاص نہیں ہے تو نہ اس کو خود کچھ فائدہ ہوگا اور نہ اس سے پڑھنے والوں کو، تربیت حاصل کرنے والوں کو فائدہ ہوگا۔ جیسا کہ مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب نے بیان کیا، روحانیت کا سلسلہ دینی مدارس کے اندر کم ہوتا جا رہا ہے یا ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ اس سلسلے میں، میں اپنے استاذ الاستاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اپنی بیان کی ہوئی بات عرض کرنا چاہوں گا جو انہوں نے اپنی ترمذی کی تقریر میں بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں مدینہ منورہ میں پڑھ رہا تھا۔ وہاں مجھے ہدایہ اخیرین کی ایک بحث میں مشکل پیش آ گئی۔ میں نے اس کو سمجھنے کی پوری کوشش کی، شروحات دیکھیں، حواشی دیکھے، علما کی طرف رجوع کیا، لیکن مسئلہ حل نہ ہوا۔ فرماتے ہیں کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر حاضر ہوا، درود وسلام پیش کیا، مراقبہ کیا اور جب میں مراقبے سے اٹھا تو میرا وہ ہدایہ اخیرین کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ تو روحانیت کا یہ اثر ہے، کیونکہ جو ہم تعلیم پڑھ رہے ہیں یا پڑھا رہے ہیں، چاہے اس کا تعلق وحی جلی سے ہو یا وحی خفی سے، بہر حال اس کا تعلق روحانیت کے ساتھ ہے اور اس کا دار و مدار نیت پر ہے۔

گویا تمام گفتگو اور بحث کا خلاصہ نیت ہے۔ اگر انسان کی نیت ٹھیک ہے تو وہ سارے کام ٹھیک طریقے سے کرے گا۔ تعلیم ٹھیک طریقے سے حاصل کرے گا، پڑھائے گا صحیح طریقے سے اور اسی طرح اخلاق وعبادات بھی صحیح طریقے سے سرانجام دے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی کوتاہیاں دور کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

شرکا کے مابین مجلس مذاکرہ

مولانا زاہدالرشدی (ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

میں نے اپنی بات اصولی طور پر صبح کی نشست میں کہہ دی تھی۔ اس وقت میں شام کے مذاکرے کا ایجنڈا عرض کروں گا۔ یہی آخری اور اصلی نشست ہوگی اور اسی کی روشنی میں سیمینار کی رپورٹ مرتب کی جائے گی۔

ایجنڈا استاد کی تربیت کے حوالے سے ہوگا۔ اس کو ہم اس طرح سے تقسیم کریں گے:

۱۔ فکری تربیت، اس سے مراد یہ ہے کہ ہم جو تعلیم وتعلم کا کام کرتے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے اور ہدف کیا ہے؟ یہ ساری کھیپ ہم کیوں تیار کر رہے ہیں اور سوسائٹی میں اس کا رول کیا ہوگا؟ وہ مقصد اگر استاد کے ذہن میں ہوگا تو جو کلاس اس کے سامنے بیٹھی ہے، وہ اس مقصد کے مطابق اس کی تمام ضروریات کو پورا کرے گا کہ ان طلبہ کو اس مقصد کے لیے تیار کرنا ہے اور وہ ویسی ہی تربیت کرے گا۔ اس سلسلے میں استاد کی ذہن سازی ہونی چاہیے۔

۲۔ علمی تربیت، اس سے میری مراد یہ ہے کہ جب ہم ایک سند لے کر ایک مسند پر بیٹھ جاتے ہیں تو وہ سند ہمارے لیے اسٹاپ بن جاتی ہے کہ اب آگے ہم نے کچھ نہیں پڑھنا ہے۔ جو کچھ پڑھ لیا، وہ کافی ہے تو وہ سند ہمارے لیے بریک بن جاتی ہے۔ اگر استاد کے علم میں ترقی وارتقا نہیں ہوگا اور وہ یہی سوچے گا کہ جو کاپی میں نے پہلے سال پڑھائی تھی، وہی اب بھی پڑھانی ہے تو طلبہ کو اس

زیادہ فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر استاد کے علم میں ترقی نہیں ہوگی تو شاگرد کے علم میں بھی ترقی نہیں ہوگی اور وہ جمود کا شکار رہے گا۔ علمی تربیت سے مراد یہ ہے کہ اساتذہ میں مطالعہ کا ذوق پیدا کیا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں اور ان کے علم میں گہرائی اور گیرائی دونوں ہوں۔ میرے ایک دوست پروفیسر ہیں۔ انہوں نے بڑی دلچسپ بات سنائی کہ ایک جگہ مذاکرہ ہو رہا تھا تو میں نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ عربی ادب آپ پڑھاتے ہیں' لیکن عربی ادب کے بارے میں معلومات ہمیں زیادہ ہیں۔ مثلاً شعرا کے نام' اشعار کا پس منظر اور تاریخ ادب وغیرہ، تو انہوں نے جواباً کہا کہ عربی ادب کے بارے میں اگرچہ آپ زیادہ جانتے ہیں، لیکن عربی ادب (زبان) ہم زیادہ جانتے ہیں۔ تو یہ دونوں چیزیں ہونی چاہئیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی بھی علم کبھی ایک جگہ پر نہیں رکا۔ اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نور الانوار میں نے دس مرتبہ پڑھائی ہے۔ نور الانوار ملا جیونؒ نے آج سے تین سو سال قبل لکھی ہے اور ان تین سو سالوں میں حنفی اصول فقہ نے بہت ترقی کی ہے اور بہت آگے بڑھا ہے۔ اب طالب علم کا کیا قصور ہے کہ اسے گیارھویں صدی کے علم اصول فقہ تک روک دیا جائے اور بعد میں ہونے والی ترقی کے بارے میں اس کو معلومات فراہم نہ کی جائیں؟ مثلاً جو اضافات ہوئے ہیں' جو نئی اصطلاحات آئی ہیں، وہ کیوں اس کو نہ بتائی جائیں؟ اس کے دو حل ہیں۔ ایک تو یہ کہ نصاب میں نئی کتابیں شامل کی جائیں۔ دوسرا یہ کہ استاد کچھ محنت کر کے وہ جدید مواد اپنے مطالعہ میں لے آئے تو وہ نور الانوار کو سامنے رکھ کر بھی ساری بات کر سکتا ہے۔

۳۔ اخلاقی اور دینی تربیت، آج کی جدید تعلیم اور دینی تعلیم میں بڑا فرق ہے کہ جدید تعلیم میں استاد صرف استاد ہے اور اس کا کام صرف پڑھانا ہے' جبکہ دینی تعلیم میں استاد صرف استاد نہیں بلکہ اپنے طلبہ کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ طالب علم نے استاد کے رنگ میں رنگا جانا ہے۔ استاد کو دیکھ کر طالب علم کی عادتیں بنیں گی' عقیدہ بنے گا۔ ہمارے ہاں تو عقیدہ استاد کو دیکھ کر بنتا ہے کہ فلاں عقیدہ کی تشریح جو میرے استاد کی ہے، وہی میری ہے۔ فلاں مسلک کے بارے میں میرے استاد کی رائے یہ ہے اور میری بھی یہ ہے۔ تو استاد کو تمام باتوں میں ماڈل بننا

چاہیے۔ آج کل کے دور میں دینی استاد بننا بڑا مشکل ہے۔ استاد اگر رخصتوں پر آ جائے گا تو طالب علم مباحات ومکروہات میں چلا جائے گا۔ اگر طالب علم کو رخصتوں پر رکھنا ہے تو استاد کو عزیمت پر رہنا ہوگا' اپنی عبادات میں' اخلاق میں' میل جول میں اور اس طرح کے بہت سے معاملات میں۔

۴۔ فنی تربیت، اب تعلیم کے بہت سے جدید ذرائع آ گئے ہیں۔ ان میں سے جو جائز ہیں اور جن سے آپ مطمئن ہیں' ان کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر فن کے حوالے سے ہم یونانی فلاسفہ سے استفادہ کر سکتے ہیں تو آج کے فلاسفہ سے بھی ہمیں استفادہ کرنا چاہیے۔

پروفیسر میاں انعام الرحمٰن (گورنمنٹ ڈگری کالج، قلعہ دیدار سنگھ)

صبح کی پہلی نشست میں تو میں شریک نہیں ہو سکا۔ دوسری نشست سے جو باتیں میں نے سنی ہیں، ان میں ایک بات جو بار بار دہرائی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ شاید کالج سائیڈ میں اساتذہ کی تربیت کا خاطر خواہ انتظام ہے اور مدارس میں ایسا نہیں، حالانکہ بعینہ یہی صورت کالج سائیڈ میں ہے۔ ٹیسٹ، انٹرویو دیا اور آ کر پڑھانا شروع کر دیا۔ سوچتے ہی نہیں کہ کیسے پڑھانا ہے اور کیا پڑھانا ہے، کیا لیکچر وغیرہ دینا ہے۔ البتہ اسکول کی سطح پر تھوڑا بہت تربیت کا نظام موجود ہے۔ گورنمنٹ سی ٹی، بی ایڈ وغیرہ کچھ کورسز کرواتی ہے۔ لیکن کالج کی سطح پر اب بھی ایسا نہیں ہے۔ آپ سادہ ایم اے ہوں، آپ نے ٹیسٹ دیا ہے، بغیر کسی ٹریننگ کے آپ کالج میں جاتے ہیں اور لیکچر دینا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نہ مدارس میں پڑھا ہوں، نہ مجھے زیادہ تجربہ ہے، لیکن میرا مشاہدہ اس کے بارے میں یہ ہے کہ کالج سائیڈ میں جو ٹیچر ہے اور مدرسہ میں جو ٹیچر ہے، دونوں میں بنیادی فرق طالب علم کے ساتھ ڈیلنگ کے حوالے سے پایا جاتا ہے۔ جو مدرسے کا استاد ہے، وہ اپنے آپ کو زیادہ ترجیح دیتا ہے، زیادہ تقدس کا درجہ دیتا ہے جبکہ کالج سائیڈ میں یہ بات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب طالب علم کو ڈیل کیسے کرنا ہے، اس کی ٹریننگ وہاں بھی نہیں ہوتی اور یہاں بھی نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ٹریننگ پہلے لے کر آئے ہیں، یہ اسی کا اثر ہے۔ تو مجھے جو بنیادی فرق نظر آتا ہے، وہ یہی ہے کہ دینی مدارس کے جو طلبہ ہیں، وہ استاد کی اتنی زیادہ تعظیم کرتے

ہیں، اتنا زیادہ تقدس کا درجہ دیتے ہیں کہ شاید اس کے بعد اس کو وہ ٹوک نہیں سکتے اور نہ اس کی ہمت کر سکتے ہیں کہ سوال کریں اور استاد سے سیکھنے کی کوشش کریں۔ علم تو ہوتا ہی سوال و جواب ہے، تو جب آپ اس کو زیادہ تقدس کا درجہ دیتے ہیں تو پھر آپ اس سے سیکھ نہیں سکتے۔ پھر تو ہاں ناں ہوگا جیسے کنٹری میں ہوتا ہے۔

حافظ محمد سمیع اللہ فراز (فاسٹ نیشنل یونیورسٹی، لاہور)

سب سے پہلے تو یہ بے حد خوشی کا مقام ہے کہ اس طرح کی تربیتی ورکشاپ منعقد کرنے میں الشریعہ اکادمی نے پہل کی ہے۔ ہمارے ضلع گوجرانوالہ میں اتنا بڑا حلقہ ہے دینی مدارس کا، شاید ہی کسی اور شہر میں اتنا زیادہ ہو۔ اس اعتبار سے یہاں ضرورت بھی زیادہ تھی۔ اس پر اللہ کا شکر ہے کہ الشریعہ اکادمی نے اس کا اہتمام کیا ہے۔

استاد گرامی مولانا زاہد الراشدی صاحب نے جو چار نکات ایجنڈے کے لیے رکھے ہیں، ان میں سے اساتذہ کی فکری اور اخلاقی تربیت یقیناً ایک اہم ضرورت ہے اور انھیں اس حوالے سے راہنمائی ملنی چاہیے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایک معلم کی سطح پر پہنچ جانے والے کسی شخص کو اخلاق سکھانا یا اس کی فکر کو درست کرنا نفسیاتی طور پر ایک نازک مسئلہ ہے، اور بنیادی طور معلم کو خود اس پر توجہ دینی چاہیے کہ وہ مطالعے کے ذریعے سے اپنی فکر کو کس طرح درست کرتا ہے یا اپنے اخلاق کو کس طرح سنوارتا ہے۔

جہاں تک علمی اور فنی تربیت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے میری چار گزارشات ہیں:

پہلی بات یہ کہ چونکہ میں دینی مدارس میں بھی پڑھا ہوں اور اس کے بعد یونیورسٹی میں بھی پڑھانے کا تجربہ ہے تو جب ہم یونیوسٹی کا اور مدرسے کا ایک موازنہ کرتے ہیں تو اس میں سب سے بڑا فرق ہمیں نظر آتا ہے، وہ ہے کسی فن میں اسپیشلائزیشن یا مہارت کا۔ کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے کہ ایک ہی وقت میں صرف اور فقہ اور نحو اور منطق، چاروں میرے پسندیدہ مضمون ہوں اور میں ان کو پڑھاؤں بھی، یہ نہیں ہوسکتا بلکہ ہر طالب علم ان میں سے کسی ایک کا انتخاب زمانہ طالب علمی میں ہی کر لیتا ہے۔ میں نے جب مدرسے میں پڑھانا شروع کیا تو استاد محترم نے پوچھا کہ ایک

سبق ایسا لیں جس میں آپ کو زیادہ رغبت ہو، تو میں نے کہا کہ فقہ سے مجھے زیادہ رغبت ہے۔ اب یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک استاد ہر فن میں ماہر ہو، یہ ایک فطری رجحان ہوتا ہے۔

ہمارے مدارس میں اس کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً ایک استاد نے ہدایۃ النحو یا کافیہ ایک سال پڑھایا تو اگلے سال اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ طالب علم ہدایۃ النحو ایک استاد سے پڑھ کر اس استاد کا انداز سمجھتا ہے تو اگلے سال کافیہ پڑھانے والا استاد بالکل اور طریقے سے پڑھاتا ہے تو طالب علم کا جو ایک رجحان بنا تھا اور وہ ہدایۃ النحو جو ذہن میں لے کر آیا تھا، وہ یکسر آ کر دوسرے استاد کے انداز نے بدل دیا۔ تو یہ جو وقفے آ جاتے ہیں، اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اس حوالے سے میں گزارش کروں گا کہ ایک استاد اگر نحو پڑھا رہا ہے تو اسے مسلسل اس کا موقع دیا جائے تاکہ وہ نحو میں ماہر ہو اور اس کی شہرت ہو جائے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک استاد تمام فنون میں یکساں مہارت حاصل کر لے۔ یونیورسٹی میں یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک استاد تقابل ادیان پڑھا رہا ہے تو وہ وہی پڑھائے گا کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ تقابل ادیان کا مالہ وما علیہ کیا ہے۔

دوسری بات ہے طریقہ تدریس کی۔ ہمارا طریقہ تدریس یہ ہے کہ جو ہم دیکھتے چلے آ رہے ہوتے ہیں اور جس طرح ہم نے استاد کو پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے، اسی طرح ہم کوشش کریں گے کہ آگے پڑھائیں، کیونکہ ہمیں بتایا ہی نہیں گیا اور نہ ہم نے اپنے استاد کے علاوہ کسی اور کو پڑھاتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب جدید طریقہ تدریس میں ملٹی میڈیا آ گیا ہے، بلیک بورڈ آ گیا ہے، لیکن یہ تمام چیزیں ابھی تک ہمارے مدارس میں مفقود ہیں۔ ہمارے مدارس میں طریقہ یہ ہے کہ استاد بیٹھا ہوا ہے اور تلقی اور بالمشافہہ تدریس کا جو سلسلہ ہے، وہی چلتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ اس وقت مفید تھا جب لوگوں کے حافظے بہت اچھے ہوتے تھے۔ استاد نے ایک بات کہی اور طالب علم نے اس کو محفوظ کر لیا۔ لیکن اب نہ وہ مزاج رہے ہیں، نہ وہ حافظے رہے ہیں اور نہ ہمارے مدارس میں اس قسم کے طلبہ آتے ہیں۔ اس بات کو ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ جو بچہ گھر میں سب سے نکما ہوگا، اس کو مدرسے میں داخل کرا دیں گے۔ تو جب طلبا کی ذہنی سطح یہ ہو تو اس میں پھر ہمیں ان تمام چیزوں کا سہارا لینا چاہیے جو تدریس میں اضافی معاونت کا ذریعہ

بن سکتی ہوں۔ایک استاد اگر زبان سے کچھ کہتا ہے اور طالب علم اس کو سنتا ہے، پھر اس کا تکرار ہو گیا، مطالعہ ہو گیا تو اس طرح ایک محدود وقت کے لیے وہ بات طالب علم کے ذہن میں رہتی ہے، لیکن اس میں اس کے سمجھنے کی ایک ہی حس استعمال ہوئی ہے' اس نے صرف سماعت کی ہے۔لیکن اس کے بجائے اگر بلیک بورڈ استعمال کیا جائے' ملٹی میڈیا استعمال کیا جائے تو اس سے طالب علم کے دیگر حواس بھی کام کرتے ہیں۔استاد نے ایک چیز لکھ کر طالب علم کو سمجھائی ہے تو اس نے سنی بھی ہے، دیکھی بھی ہے اور سمجھی بھی ہے۔کتنے حواس سے وہ چیزوں کو اخذ کر رہا ہے۔تو میرا خیال ہے کہ ہمارے طریقہ تدریس میں تبدیلی ضرور آنی چاہیے۔کم از کم بلیک بورڈ کا استعمال تو ضرور کیا جائے' حتیٰ کہ اگر وہ کوئی ایسا فن پڑھا رہا ہے جس میں اس کی ضرورت نہیں پڑتی تو بھی وہ اس میں ایسی چیزیں لے کر آئے کہ اس کا استعمال ہو سکے۔طالب علم کے حواس کو جتنا آپ مصروف رکھ سکتے ہیں، رکھیں۔

تیسری بات یہ کہ ہمارا تدریس کا مواد بھی بالکل روایتی ہے کہ جس طرح پہلے پڑھایا جاتا تھا، ویسے ہی آج بھی پڑھایا جا رہا ہے۔نصاب کی بحث اپنی جگہ لیکن اتنا تو ہم کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھا رہے ہیں، مثلاً فقہ پڑھا رہے ہیں یا جدید معیشت وتجارت پڑھا رہے ہیں تو اس کے بارے میں ہمارے معاشرے کے اندر جو عملی مثالیں ہیں، ان کا استعمال زیادہ کیا جائے۔اس سے میں سمجھتا ہوں کہ طالب علم کے ذہن میں کتاب اور شرح سے ہٹ کر ایسی چیزیں آئیں گی جو استاد کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتیں اور وہ چیزیں طالب علم کبھی بھلا نہیں سکتا، کیونکہ وہ عملی طور پر اس کو اپنے ذہن میں لے رہا ہوتا ہے۔تو تیسری چیز یہ ہے کہ عملی مثالیں اپنے تدریسی مواد میں شامل کریں۔

چوتھی بات زبان کا استعمال ہے۔بدقسمتی سے میرے سمیت جو نئے معلمین ہیں' عربی زبان تو دور کی بات ہے، اردو زبان جس میں ہم پڑھا رہے ہوتے ہیں، وہ بھی ہماری گرفت میں نہیں ہوتی۔اس میں ہمیں اعتماد پیدا کرنا چاہیے۔اگر ایک استاد کی زبان عمدہ اور موثر ہے تو اس کے اپنے اثرات ہوں گے۔اگر معلم اس میں فرق نہیں کر سکتا کہ نہر بہتا ہے یا بہتی ہے تو طالب علم بھی ساری

زندگی اس پر توجہ نہیں دے گا۔ یہ چار باتیں فنی اور عملی تربیت کے حوالے سے تھیں۔

پانچویں بات جو ضمنی ہے، وہ ہمارا رہن سہن کا طریقہ ہے۔ اس کو بھی بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ایک استاد صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنتا ہے تو طلبا اس کو دیکھ کر اپنا رہن سہن بہتر کر لیں گے، اس کو کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کیونکہ ایک حقیقی معلم کی حیثیت اپنے طلبا کے لیے ایک نمونہ کی سی ہوتی ہے۔ ایک معلم کا رہن سہن، اس کا کلاس میں آنا، کلاس سے اٹھ کر جانا، اپنے طلبہ کے ساتھ ملنا جلنا اگر بہتر ہے تو اس سے طلبہ کے اخلاق و کردار پر اثر پڑے گا۔

سب سے بڑی ضرورت جو میں محسوس کرتا ہوں، وہ یہ کہ طلبہ کو سوال کرنے اور اظہار خیال کرنے کا موقع دیا جائے اور اس میں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ میں مدرسے سے یونیورسٹی میں گیا۔ مدرسے میں، میں یہ سمجھتا تھا کہ اپنی کلاس میں اور اردگرد کے ساتھیوں میں زیادہ باتونی ہوں۔ مدرسے میں ہم تقریریں بھی کیا کرتے تھے، زمانہ طالب علمی سے جمعہ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں ایک پروگرام ہوتا ہے کہ جس چیز پر آپ نے لکھا ہے، اس کو آ کر بیان کریں۔ جب وہاں ڈیسک پر کھڑے ہوئے تو آپ یقین کریں کہ جو کچھ وہ بول رہے تھے، وہ نہ ہماری سمجھ میں آ رہا تھا نہ ہم وہ بول سکتے تھے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہمارے پاس مواد نہیں تھا یا الفاظ نہیں تھے، کمی صرف اعتماد کی تھی۔ تو استاد کو چاہیے کہ اپنے طلبہ کا اعتماد بڑھائے۔ ان کو اتنا اعتماد دلائے کہ اگر ان کو صدر کے سامنے بھی کھڑا کر دیا جائے تو وہ اپنی بات کہہ سکیں۔

اپنے طلبہ میں اعتماد کیسے پیدا کیا جائے؟ اس کے بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً جب آپ اس کو پڑھا رہے ہوں تو آپ خود اس کو اعتماد سے پڑھائیں اور جب آپ سبق سنیں یا ٹسٹ لیں تو اس کا اعتماد چیک کریں۔ وہ اگر غلط لکھتا ہے تو اس کو اعتماد سے بتائیں۔ آپ نے اگر اس کو دس نمبروں میں سے صفر دیا ہے کہ بس وہ جائے اور اگلے دن کے ٹسٹ کی تیاری کر کے آئے تو اس طرح نہ طالب علم کو اس ٹسٹ کا فائدہ ہوگا نہ آپ کو۔

یہ میری کچھ گزارشات تھیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔ آمین۔

مولانا محمد طارق بلالی (مدرسہ اشرف العلوم، گوجرانوالہ)

میری ایک گزارش ہے کہ ہمارے ہاں مدرسین بھی اور متعلمین بھی احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اگر ابتدا ہی سے اس علم کی عظمت اور اس کی اہمیت طلبہ کے ذہنوں میں بٹھا دی جائے تو یہ کافی حد تک کم ہو سکتی ہے۔ ہمارے طلبہ جب اسکول و کالج کے طلبا کے ساتھ بیٹھتے ہیں تو وہ خود کو ان سے کمتر سمجھتے ہیں اور ان میں اتنی استعداد نہیں ہوتی کہ وہ اپنے علم کی اہمیت و عظمت کو ان کے سامنے بیان کر سکیں۔ تو طلبا میں خود اعتمادی پیدا کرنی چاہیے۔ دوسرا یہ کہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہم نے خود پڑھا ہوتا ہے، ویسے ہی آگے پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طریقہ میں کوئی بہتری بھی آ سکتی ہے، اس بارے میں ہم بالکل نہیں سوچتے۔ اللہ رب العزت توفیق نصیب فرمائے۔

مولانا حافظ محمد یوسف (الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ)

محترم سامعین!

آپ مختلف اصحاب فکر و دانش کی گفتگو سن رہے ہیں۔ ان کی گفتگو کی روشنی میں ایک بات تو یہ سامنے آئی کہ عصری علوم کی طرف ہمارے مدارس کو قدم بڑھانا چاہیے۔ البتہ میرا چھ سات سال کا تجربہ یہ ہے کہ عصری علوم کے ساتھ اگر تربیت نہ ہو تو عصری علوم کے ساتھ دین ایک فتنہ بن جاتا ہے۔ میں پی ایف اے میں وارنٹ آفیسر بھرتی ہو گیا۔ ایک دفعہ ایجوکیشن کا اجلاس ہو رہا تھا، میں بھی موجود تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ آئندہ جو خطبا ہم بھرتی کریں تو دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو بھرتی نہ کریں۔ میں نے ایجوکیشن آفیسر سے اس کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ وہ ایک مخصوص زاویہ فکر کے ساتھ یہاں آتے ہیں۔ ہمارا ٹارگٹ یہ ہے کہ ہم ان کی جگہ یونیورسٹی سے ایم۔اے پاس طلبہ کو خطیب کی حیثیت سے بھرتی کریں۔ میں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے، آپ انہیں بھرتی کریں لیکن میں علیٰ وجہ البصیرۃ عرض کرتا ہوں کہ سو فیصد نہیں تو ستر فیصد ایسے طلبہ ہوں گے جو مصلائے امامت پر کھڑے ہونے کے اہل نہیں۔ یہ بات میں پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں اور میرا اپنا تجربہ بھی ہے کہ ایم اے پاس طلبہ کی جب تک دینی تربیت نہ ہو گی،

وہ اس کے اہل نہ ہوں گے کیونکہ اس میں سے اکثر تو امامت کو اپنے اسٹیٹس کے خلاف سمجھتے ہیں۔ تو بغیر تربیت کے عصری علوم کی طرف کوئی بھی قدم ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھولنے کے مترادف ہوگا۔

انگلش لینگویج کی بھی بات ہوئی۔ میں انگلش زبان کا ماہر تو نہیں ہوں، لیکن انگلش پڑھاتے ہوئے کچھ عرصہ ہو گیا ہے۔ جب زبان بغیر تربیت کے آتی ہے تو لامحالہ اپنا ماحول ضرور لے کر آتی ہے۔ بڑی معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ ہمارے طلبہ مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہیں، سب کی بات نہیں کر رہا کیونکہ سب کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، مدرسے سے نکلتے ہیں تو چہرے پر ڈاڑھی اور سر پر پگڑی بھی ہوتی ہے، لیکن دکتورہ کی ڈگری ملنے تک ستر فیصد شیو کروا چکے ہوتے ہیں۔ یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے۔ میں نے بہت سے ساتھیوں کو دیکھا۔ میں نے اپنے ایک طالب علم کو اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں بھیجا۔ جب وہ ملنے کے لیے آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی ڈاڑھی کٹی ہوئی ہے۔ میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ بھئی، تمہیں اس کام کے لیے تو وہاں نہیں بھیجا تھا۔ تو وہ کہنے لگا کہ استاد جی، یہ سنت ہی تو ہے، فرض تو نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، فرض نہیں ہے لیکن سنت تو تم خود اسے تسلیم کر رہے ہو اور یہ کہ تمھارا یہ جواب مسلمانوں والا نہیں ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک چھوٹی سی بات ہے، لیکن میں اسے ضروری خیال کرتا ہوں کہ انگلش ضرور سیکھیں، کمپیوٹر ضرور سیکھیں، لیکن اکابر کے مزاج اور راہ کو بھی نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے پاس بہت بڑا سرمایہ ہے۔

حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بارے میں، میں نے کہیں پڑھا کہ انہوں نے کافیہ تک کتابیں پڑھی تھیں، لیکن حضرت کا فیضان اللہ تعالیٰ نے کتنا پھیلایا! اس وجہ سے کہ پوری امت کے علما کے ساتھ جب تعلق ہوگا تو اللہ تعالیٰ فیض کو آگے پھیلا دیں گے۔ چودہ سو سال کے امت کے اجتماعی تعامل کو چھوڑ کر دین کو سمجھنے کی کوئی بھی کوشش ایک بہت بڑے فتنے کا باعث ہوگی اور کئی ایسے فتنے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ انہوں نے مدرسے میں تعلیم حاصل کی، پھر ایم اے کیا اور نیوی میں خطیب بھرتی ہو گئے۔ بعد میں سول جج بھرتی ہو گئے۔ اب چند دن پہلے

انہیں قطر کے سفارت خانے سے آفر آئی کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور یہاں آکر خدمات سرانجام دیں تو انہوں نے کہا کہ میں اٹھارہ بیس سال ملک کے جدید تعلیمی اداروں میں پڑھا چکا ہوں، نمل اسلام آباد میں، میں نے پڑھایا ہے، الدعوۃ اکیڈمی میں بھی پڑھایا ہے، اب میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ جو فائدہ میں مدارس میں اٹھا سکتا تھا، وہ میں وہاں نہیں اٹھا سکا۔ اب میں شعبہ حفظ کی ایک کلاس پڑھا رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اسی کو پڑھاتا رہوں۔ یہ بات میں نے ضمناً عرض کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین۔

مولانا مشتاق احمد (جامعہ اسلامیہ، کامونکی)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ امابعد !

سب سے پہلے تو میں مخدوم گرامی حضرات مولانا زاہد الراشدی مدظلہ اور ان کے رفقا کا شکر گزار ہوں کہ وہ ہمیشہ شفقت فرماتے ہیں، اور آج کی نشست میں بھی انہوں نے مجھے اظہار خیال کا موقع فراہم کیا۔ فی البدیہہ جو باتیں میرے ذہن آئی ہیں، میں وہی بیان کر رہا ہوں۔ میری آج کی جو گزارشات ہیں، ان کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو دینی مدارس کا نصاب، دوسرا اساتذہ کرام کے انتخاب کا معیار، تیسرا طلبا کی تعلیم و تربیت کا طریق کار، چوتھا جدید علوم کی سرگرمیاں اور اس طرح کی چند ایک باتیں۔ میں شق وار ہر جانب اشارہ کرتا ہوں۔

پہلی بات دینی مدارس کے نصاب کے حوالے سے کہ دینی مدارس کا نصاب بدلنا چاہیے یا نہیں بدلنا چاہیے؟ کس حد تک ترمیمات ہونی چاہئیں؟ بیسیوں سال گزر گئے، یہ بحث چل رہی ہے اور چلتی رہے گی لیکن میں اس میں صرف اتنی بات عرض کروں گا کہ اگر ہمارے بہت سے علمائے کرام، اساتذہ کرام، وفاق کے ذمہ دار حضرات موجودہ نصاب کو ہی ترجیح دیتے ہیں اور اس پر قائم ہیں کہ اس میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیے یا جزوی طور پر کوئی تبدیلی ہو تو ہو، میں اس حوالے سے عرض کروں گا کہ فنون میں پختگی حاصل کرنا اور چیز ہے اور ان درس نظامی کی کتابوں کو پڑھنا، ان کے قیل و قال میں مہارت پیدا کرنا، یہ اور چیز ہے۔ مثلاً ایک ہے شرح جامی کو سمجھنا اور ایک ہے علم نحو کو سمجھنا۔ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لیے جدید طرز کی جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں،

ان سے اساتذہ کو بھی استفادہ کرنا چاہیے اور طلبا کے لیے بھی بطور مطالعہ ایسی کتب تجویز ہونی چاہییں کیونکہ نصاب تبدیل کرنا تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے، لیکن ایسی جدید طرز کی لکھی ہوئی کتابیں اساتذہ اپنے زیر مطالعہ رکھ سکتے ہیں، طلبا کو مطالعہ کروا سکتے ہیں۔ اس کا اہتمام ضرور ہونا چاہیے۔

دوسری بات اساتذہ کے انتخاب کے معیار سے متعلق ہے۔ سرکاری طور پر ایک ٹیچر یا پروفیسر بھرتی ہونا ہو تو اس کی تقرری سے پہلے اس کے لیے تربیتی کورس کا اہتمام ہوتا ہے، اس کے بعد اس کو بطور ٹیچر یا بطور پروفیسر کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ دینی مدارس میں افسوس یہ ہے کہ ایسا کوئی نظام نہیں ہے۔ دینی مدارس میں ذاتی تعلقات اور سفارشیں بھی کام کرتی ہیں۔ ہم نے یہ بات چار پانچ سال قبل وفاق المدارس کے ناظم اعلیٰ قاری محمد حنیف جالندھری سے بھی عرض کی تھی کہ اس طرز کے کسی پروگرام کا انعقاد وفاق کے تحت ہونا چاہیے۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ یہ معاملہ زیر غور ہے، لیکن چار پانچ سال گزر گئے، اس کا کوئی پتہ نہیں چلا کہ معاملہ کہاں تک پہنچا ہے۔ اس حوالے سے میں اپنے مادر علمی جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد کا حوالہ دوں گا کہ استاذ محترم حضرت مولانا نذیر احمد اس بات کا اہتمام کیا کرتے تھے کہ دورۂ حدیث کے طلبا کو بالخصوص اور باقی طلبا کو بالعموم تدریس کا طریقہ بتلایا کرتے تھے۔ شعبان یا رمضان میں دو تین ہفتے کا خصوصی پروگرام ہوا کرتا تھا۔ اس قسم کے پروگرام ملک کے جتنے بھی بڑے بڑے مراکز ہیں، ان کو منعقد کرنے چاہییں۔ اگر وفاق کی مجبوریاں ہیں یا وفاق والے اس کا انتظام نہیں کر سکتے تو ہر ڈویژن میں ایک بڑے مدرسے والے اس کا انتظام کر لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کافی حد تک اس کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اب تعلقات کی بنیاد پر یا بعض دوسری وجوہات سے جو اساتذہ بھرتی ہو جاتے ہیں، وہ کیسے کیسے لطیفے پیدا کرتے ہیں۔ میں صرف ایک بات مثال کے طور پر عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک مدرس کو جسے فارسی پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا، حکم دیا گیا کہ فارسی پڑھانی ہے۔ اس نے طلبا کو فارسی پڑھائی۔ پڑھاتے ہوئے ایک لفظ آیا ''ترش رو''، تو اس نے اس کا معنی بیان کیا ''کھٹے منہ والا''۔

ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب بھی اس حوالے سے بات کر رہے تھے کہ اساتذہ کو اپنے ماحول کو، اپنے موضوع کو، منطق وفلسفہ جو بھی ہے اور مجموعی طور پر جو بھی ساری صورت حال ہے، اس کو اور طلبا کی نفسیات کو سامنے رکھ کر، طلبا کی تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ تعلیمی نفسیات کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا ایک استاذ کے لیے بہت ضروری ہے۔

استاذ محترم حضرت مولانا نذیر احمد کا ایک مقولہ میں نقل کرتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا کہ وہی آدمی استاد کہلانے کا مستحق ہے جو فن تدریس میں مجتہد ہونے کا ملکہ رکھتا ہے۔ جو استاد مجتہد فی التدریس نہیں ہے، وہ استاد کہلانے کے قابل نہیں۔ انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا اور اس میں سمجھنے والے کے لیے بہت کچھ ہے۔

ایک بات میں یہ عرض کروں گا کہ جدید علوم کس حد تک دینی مدارس میں ہونے چاہییں، اس حوالے سے تو دو آرا ہو سکتی ہیں، لیکن آیا اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بحث اب ختم ہو چکی ہے۔ ضرورت کو ہر کوئی مانتا ہے۔ دور حاضر میں انگلش ایک بین الاقوامی زبان ہے اور اس میں ہمارے علماے کرام کو مہارت ہونی چاہیے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے جید علماے کرام کو اس میں مہارت نہیں ہے۔ میں نے ایک دفعہ اپنے مخدوم ومحترم حضرت مولانا راشدی صاحب سے عرض کیا تھا کہ حضرت، آپ انگلش سیکھ لیں، آپ کی کارکردگی اور جتنی تبلیغ آپ کر رہے ہیں، اس سے کئی گنا آپ زیادہ کام کر سکیں گے، لیکن حضرت نے اپنے روایتی انداز میں ہنس کر ٹال دیا۔ اسی طرح کمپیوٹر کے ذریعے سے بھی علماے کرام کے لیے تبلیغ کا ایک بڑا میدان ہے۔ انٹرنیٹ میں جہاں خرافات بہت ہیں، اسی طرح کمپیوٹر میں بھی ہیں لیکن انٹرنیٹ میں تو اب بڑی بڑی لائبریریاں منتقل ہو گئی ہیں اور بڑے بڑے دینی مدارس بھی اپنی لائبریریاں انٹرنیٹ پر منتقل کر رہے ہیں۔ کراچی کے بعض مدارس کا کام اس حوالے سے شروع ہے۔ تو انٹرنیٹ کے ذریعے سے جہاں قادیانی تبلیغ کرتے ہیں، عیسائی تبلیغ کرتے ہیں، ہمیں بھی اس میدان میں آنا چاہیے اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے ہمیں بھی دین کا کام کرنا چاہیے۔

موضوع کے حوالے سے تو میری گزارشات یہی تھیں۔ آخر میں حضرت مولانا ابوالحسن علی

ندوی کا ایک ملفوظ سنانا چاہتا ہوں۔ اس ملفوظ میں میرے لیے بھی بڑا فائدہ ہوگا اور آپ کے لیے بھی ہوگا۔ حضرت نے فرمایا کہ علمائے کرام اکثر شکوہ کرتے ہیں کہ زمانہ ہماری قدر نہیں کرتا، لوگ قدر نہیں کرتے۔ فرمایا کہ یہ شکوہ اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جن میں یا خلوص کی کمی ہوتی ہے یا صلاحیت کی۔ یا تو کام کرنے کی پوری صلاحیت نہیں ہوتی یا پورا اخلاص نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایک شخص میں اخلاص بھی کامل ہو اور کام کرنے کی صلاحیت بھی پوری ہو اور لوگ اس کی قدر نہ کریں۔ جو لوگ یہ شکوہ کرتے ہیں، ان کو اپنا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے۔

تکملہ ۱

دینی مدارس کے نصاب ونظام میں اصلاحی تدابیر

الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام فکری نشست

نحمده تبارك وتعالىٰ ونصلي ونسلم على رسوله الكريم وعلى آله واصحابه واتباعه اجمعين۔

۳۔۴۔۵فروری ۲۰۰۷کو جامعہ سید احمد شہید لکھنو (انڈیا) میں برصغیر کے دینی نصاب ونظام کے حوالے سے منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار کے موقع پر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ (پاکستان) میں اس سیمینار کے ساتھ ہم آہنگی کے لیے ایک فکری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ یہ نشست ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر غلام رسول عدیم کی زیر صدارت ۳ رفروری ۲۰۰۷ بروز ہفتہ رات آٹھ بجے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں منعقد ہوئی جس میں الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی کے علاوہ اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف، جامعہ عربیہ گوجرانوالہ کے ناظم مولانا ضیاء الرحمٰن، گورنمنٹ کالج قلعہ دیدار سنگھ کے پروفیسر محمد اکرم ورک، گوجرانوالہ بار ایسوسی ایشن کے سینئر رکن چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ، پروفیسر محمد زمان چیمہ اور دیگر حضرات نے خطاب کیا۔

مولانا زاہد الراشدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ جنوبی ایشیا میں دینی مدارس کا موجودہ نظام ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آیا تھا۔ اس سے قبل اس خطے میں دینی اور عصری علوم کی تقسیم موجود نہیں تھی اور سب لوگ ایک ہی طرز کا نصاب پڑھتے تھے جس میں فارسی زبان، عربی زبان، فقہ اسلامی

اور دیگر ضروری علوم وفنون شامل تھے۔ دفتری اور عدالتی زبان فارسی تھی جبکہ عدالتوں میں فقہ حنفی نافذ تھی، اس لیے یہ نصاب قومی اور سرکاری ضرورت بھی تھا لیکن جب عدالتوں میں برطانوی قانون نافذ کر دیا گیا اور فارسی کے بجائے انگریزی، دفتری اور عدالتی زبان قرار دے دی گئی تو درس نظامی کا یہ نصاب قومی ضروریات کے دائرے سے نکل گیا۔ اس موقع پر کچھ ارباب دانش نے دینی علوم کی حفاظت اور اگلی نسل تک دین کو پہنچانے کے لیے درس نظامی کے اس نصاب کی پرائیویٹ سطح پر تعلیم وتدریس کا اہتمام کیا اور رضا کارانہ بنیادوں پر اس کا نظام قائم کیا جس کے تحت جنوبی ایشیا کے طول وعرض میں ہزاروں مدارس کام کر رہے ہیں۔

دینی مدارس کے اس نظام کی بنیاد تحفظات پر تھی اور اس کے اہداف میں اساسی طور پر یہ امور شامل تھے کہ: ۱۔ دینی علوم کی حفاظت ہو، ۲۔ عام مسلمان کا دین کے ساتھ تعلق قائم رہے اور ۳۔ اگلی نسلوں تک دینی علوم وروایات بحفاظت منتقل ہوتی رہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ان دینی مدارس نے اپنے اہداف میں شاندار کامیابی حاصل کی اور اس خطہ کے ممالک کی آزادی کے بعد بھی دینی مدارس کی ان خدمات کا تسلسل کامیابی کے ساتھ جاری ہے، مگر آزادی کے بعد اور عالمی سطح پر میڈیا کا دائرہ وسیع تر ہوتے چلے جانے کے بعد دینی مدارس کے اس تحفظاتی ماحول اور طریق کار کو ناکافی سمجھا جا رہا ہے اور بہت سے نئے تقاضے ایسے سامنے آئے ہیں جن کو پورا کرنے کی انھی مدارس سے توقع کی جا رہی ہے۔ مثلاً پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں اسلامی نظام وقوانین کے نفاذ کے حوالے سے مطلوبہ رجال کار کی فراہمی اور عدالتی، دفتری اور انتظامی ضروریات کے لیے ضروری افراد کی تیاری ایک اہم اور ناگزیر تقاضا بن چکی ہے، لیکن چونکہ مسلم ممالک کے ریاستی تعلیمی نظام اس ضرورت کو پورا نہیں کر رہے، بلکہ بعض جگہ ریاستی نظام ہائے تعلیم اس کے برعکس دفتری، عدالتی اور انتظامی ماحول کو برقرار رکھنے کا باعث بن رہے ہیں، اس لیے مسلم امہ کا باشعور طبقہ اس ملی ضرورت کی تکمیل کے لیے دینی مدارس ہی کی طرف دیکھ رہا ہے اور عمومی طور پر دینی مدارس سے یہ توقع وابستہ کر لی گئی ہے۔

اسی طرح میڈیا کا دائرہ متنوع اور وسیع تر ہو جانے کے بعد مغرب اور عالم اسلام کے

درمیان فکری جنگ، تہذیبی کشمکش اور ثقافتی تنازعات کے حوالے سے اسلام کے بنیادی احکام اور قرآن وسنت کی اساسی تعلیمات کے بارے میں شکوک وشبہات اور اعتراضات کا سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کشمکش میں مغرب کی فکری وثقافتی یلغار کے مقابلہ، اسلامی تعلیمات کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک وشبہات کے ازالہ اور آج کے گلوبل ماحول میں اسلامی احکام وتعلیمات کو موثر طور پر پیش کرنے کے لیے رجال فکر اور رجال فن کی تیاری ایک ناگزیر ضرورت کا درجہ اختیار کر چکی ہے جو مسلمان ممالک کے کسی اور ادارے کی ذمہ داریوں میں ابھی تک شامل نہیں ہے۔ اس لیے یہ توقع بھی دینی مدارس سے وابستہ کر لی گئی ہے اور دینی مدارس سے تقاضا کیا جا رہا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے رجال فکر اور رجال فن کی تیاری کو اپنے پروگرام میں شامل کریں۔

اس کے ساتھ ہی آج کے عالمی اور گلوبل ماحول میں اسلام کی دعوت وتبلیغ اور پوری دنیا میں نسل انسانی تک اسلام کی دعوت اور قرآن وسنت کی تعلیمات کو خالصتاً دعوتی انداز میں پہنچانا بھی ہماری دینی وملی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ حضرات کی ہر سطح پر ضرورت ہے اور عام طور پر باشعور مسلمان دینی مدارس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس ضرورت کا احساس کریں اور اس کی تکمیل کو اپنے اہداف اور پروگرام میں شامل کریں۔

اس لیے جہاں تک دینی مدارس کے اس نظام کے ان تحفظاتی اہداف کا تعلق ہے جن کے لیے یہ نظام ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آیا تھا، اس میں تو یہ بعض خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود کامیابی کے ساتھ پیش رفت کر رہا ہے، لیکن آج کے حالات کی روشنی میں اس نظام سے جو نئی توقعات وابستہ ہوگئی ہیں، ان کے حوالے سے بہرحال ایک بہت بڑا خلا موجود ہے اور دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کو یہ خلا پر کرنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔

پروفیسر غلام رسول عدیم نے اپنے تفصیلی خطاب میں دینی مدارس کے موجودہ نظام ونصاب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا اور اس بات پر زور دیا کہ تعلیمی معیار اور طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کے حوالے سے موجودہ صورت حال تسلی بخش نہیں ہے اور متعدد اصلاحات کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ مدارس کے قیام کے سلسلے میں کوئی منظم پروگرام اور منصوبہ بندی موجود نہیں

ہے اور مدارس قائم کرنے والے اپنا نصاب، تربیتی نظام اور معیار قائم کرنے میں کسی ڈسپلن کے پابند نہیں ہیں جس کا نقصان سب کو نظر آ رہا ہے۔ اس کے لیے دینی مدارس کے وفاقوں کو سنجیدگی کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے مدارس کی فہرست بنائی جائے، ان کے کوائف جمع کیے جائیں اور دیکھا جائے کہ کون سا مدرسہ کس دائرے میں اور کس سطح پر کام کر رہا ہے۔ پھر ان مدارس کی درجہ بندی کی جائے، ہر طالب علم کو دورۂ حدیث تک پہنچانا ضروری نہیں۔ اس طرح درجہ بندی کی جائے کہ امامت وخطابت اور اس طرح کی دیگر ضروریات کے لیے الگ معیار قائم کیا جائے اور اس کو کافی سمجھا جائے جبکہ اس کے اوپر کی سطح کے لیے طلبہ کی ذہانت اور ذوق کے مطابق مختلف علوم وفنون کے لیے ان کا انتخاب کیا جائے اور جو ضروریات ملی طور پر محسوس کی جا رہی ہیں، ان کے مطابق مستقل طور پر ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا جائے۔

نصاب میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس طرح نہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ مضامین گھسیڑ دیے جائیں، بلکہ اس طور پر کہ تخصص کے الگ الگ شعبے بنائے جائیں اور ہر شعبہ کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا نصاب مرتب کیا جائے اور یہ کام ماہر اساتذہ اور متعلقہ علوم کے متخصصین کے ذریعے انجام دیا جائے۔

انھوں نے کہا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے معیار کو سخت کیا جائے، ملی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ اس سطح پر کام کرنے والے علما کو عالمی زبانوں، بالخصوص انگریزی پر عبور حاصل ہو اور وہ حالات زمانہ سے واقف ہوں۔

مولانا محمد یوسف نے اپنے خطاب میں کہا کہ مدارس کی درجہ بندی کی جائے اور الگ الگ تعلیمی مراحل قائم کیے جائیں تاکہ ایک مرحلہ تک تعلیم حاصل کرنے والا طالب علم اس سطح پر خدمات انجام دینے کا اہل سمجھا جائے اور اس سے اگلے مرحلہ تک اسے زبردستی نہ لے جایا جائے۔ اسی طرح علمائے کرام، ائمہ اور خطبا میں عوامی سطح پر کام کرنے کا ذوق پیدا کیا جائے اور اس کے لیے ان کی تربیت کی جائے، کیونکہ ہمارے ائمہ اور خطبا جہاں جاتے ہیں، ان کا وہاں کے عوام اور ان کی دینی ضروریات سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ وہ پہلے سے ایک طے شدہ ذہن لے کر جاتے ہیں

اور ارد گرد کے ماحول اور ضروریات کو سمجھے بغیر اپنا ایجنڈا چلانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے خرابیاں جنم لیتی ہیں۔

مولانا ضیاء الرحمٰن نے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ ہمارے مدارس کے طلبہ میں انقیاد وتسلیم کا جذبہ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ طلبہ میں تخلیقی صلاحیتوں اور فکر ونظر میں وسعت وترقی کی طرف خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ دینی مدارس کے درمیان مشاورت اور رابطہ کا ایسا نظام موجود ہونا چاہیے کہ سب ایک دوسرے کے کام کی نوعیت سے واقف ہوں تا کہ کسی کام میں خواہ مخواہ تکرار نہ ہو اور کوئی ضروری کام رہ نہ جائے۔

چودھری محمد یوسف ایڈووکیٹ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ مدارس کے نظام ونصاب میں بہتری پیدا کرنے کے لیے عرصہ دراز سے بحث ومباحثہ کا سلسلہ جاری ہے، لیکن عملی طور پر اس سمت میں کوئی واضح پیش رفت نہیں ہو رہی۔ انھوں نے کہا کہ کوئی عملی قدم اٹھائے بغیر محض بحث ومباحثہ کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا جائے گا، اس لیے اب اس بحث کو عملی طور پر نتیجہ خیز بنانے کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔

پروفیسر محمد زمان چیمہ نے کہا کہ مسلمانوں کے زوال کی اصل وجہ جہالت اور لاعلمی ہے اور ہم بحیثیت قوم نہ اپنے تاریخی وعلمی ورثے سے واقفیت کی ضرورت کا کوئی احساس رکھتے ہیں اور نہ زمانے کی نبض پر ہمارا ہاتھ ہے۔ اس لیے اس رویے میں تبدیلی پیدا کیے بغیر کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

مقررین اور شرکا نے جنوبی ایشیا میں دینی مدارس کے کردار کو سراہتے ہوئے فکری ونظری بیداری کے لیے ندوۃ العلماء لکھنو اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمات پر بطور خاص خراج تحسین پیش کیا اور جامعہ سید احمد شہید لکھنو کے سربراہ مولانا سید سلمان الحسینی کی دینی وتعلیمی مساعی کی تحسین کرتے ہوئے ۳۔۴۔۵ فروری کو منعقد ہونے والے بین الاقوامی تعلیمی سیمینار کے ساتھ ہم آہنگی کے اظہار کے ساتھ اس کی کامیابی کے لیے دعا کی۔

تکملہ ۲

عامۃ الناس کی تعلیم وتربیت اور ائمہ وخطبا کی ذمہ داریاں

الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام تربیتی نشست

۱۱؍ جون ۲۰۰۷ کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ''عامۃ الناس کی تعلیم وتربیت اور ائمہ وخطبا کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے ایک تربیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر کے علما اور ائمہ وخطبا کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت اکادمی کے ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی نے کی جبکہ مولانا داؤد احمد، مولانا حافظ محمد یوسف اور مولانا عبدالواحد رسول نگری نے عوام الناس میں دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں کے حوالے سے ائمہ وخطبا کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی۔

اس نشست کا اہتمام گزشتہ سال الشریعہ اکادمی کے تعاون سے شہر کی دو درجن سے زائد مساجد میں ۳۰ روزہ فہم دین کورس کے کامیاب سلسلے کے تناظر میں کیا گیا۔ اس سلسلے کو مربوط اور منظّم انداز میں آگے بڑھانے کے لیے ایک ''مجلس مشاورت برائے تعلیمی وتربیتی کورسز'' قائم کی گئی ہے جس کا امیر مولانا داؤد احمد، استاذ حدیث مدرسہ مظاہر العلوم گوجرانوالہ کو منتخب کیا گیا ہے۔

تربیتی نشست سے خطاب کرتے ہوئے مولانا داؤد احمد نے کہا کہ ہر داعئ حق کو نتائج کی پروا کیے بغیر خلوص اور استقامت کے ساتھ دین حق کا پیغام عامۃ الناس تک پہنچانے کے لیے اپنی تمام تر کوششیں بروے کار لانی چاہییں اور یہ خیال کبھی ذہن میں نہیں لانا چاہیے کہ استفادہ کرنے والوں کی تعداد تھوڑی ہے یا زیادہ۔ انھوں نے کہا کہ یقیناً ائمہ اور خطبا کو بہت سے مسائل اور

نامناسب رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن انھیں دین کی نصرت اور رضاے الٰہی کے حصول کے جذبے کے ساتھ پوری لگن سے دعوت واصلاح کا کام کرتے رہنا چاہیے۔

الشریعہ اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف نے فہم دین کورس کے سلسلے کے آغاز اور اس کے ثمرات ونتائج پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ۱۹۹۹ میں الشریعہ اکادمی میں ترجمہ قرآن مجید کی کلاس کے آغاز کے بعد یہ ضرورت سامنے آئی کہ عام لوگوں کے لیے مختصر دورانیے کے کورسز بھی ہونے چاہییں، چنانچہ ۲۰۰۳ میں فہم دین کورس کا سلسلہ شروع کیا جس کی اب تک چھ کلاسز منعقد کی جا چکی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے کی افادیت کو دیکھتے ہوئے شہر کے دیگر علماے کرام کو بھی اس طرف توجہ دلائی گئی اور گزشتہ رمضان المبارک میں تقریباً ۲۵ مساجد میں اس کورس کا اہتمام کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ اس سلسلے کو باہمی تعاون اور مشاورت کے ساتھ مزید آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مدرسہ اشرف العلوم کے مدرس مولانا عبدالواحد رسول نگری نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہمارے معاشرے میں اس وقت دو قسم کے طبقات پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو دین سے دور ہیں اور دوسرے وہ جو دین سے بے زار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان دونوں طبقوں کا ذہنی پس منظر اور نفسیات الگ الگ ہیں اور علما اور خطبا کو اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے معاشرے میں دعوت دین کی حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنی بے علمی اور بے فکری اور علما کی کوتاہی کی وجہ دین سے دور ہے اور ایسے لوگوں تک پہنچ کر انھیں دینی تعلیمات سے روشناس کرانا نسبتاً آسان ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں مختصر دورانیے کے کورسز کو ایک مفید اقدام قرار دیا اور کہا کہ ایسے کورسز سے دین سے دور اور دین سے بے زار، دونوں طبقوں کو مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔

اکادمی کے ڈائریکٹر مولانا زاہد الراشدی نے اپنی اختتامی گفتگو میں مولانا عبدالواحد رسول نگری کی بات کی تائید کی اور اس کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ معاشرے میں موجود دونوں طبقوں کے دین سے دور ہونے کی اصل وجہ بے خبری ہے، البتہ دین سے دور طبقے میں بے خبری کا قصوروار

خود وہ طبقہ ہے جبکہ دین سے بے زار طبقے کے معاملے میں بے خبری کی ذمہ داری علما اور ائمہ وخطبا پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے ائمہ وخطبا کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے عامۃ الناس کی تعلیم وتربیت اور اس کے تقاضوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ دین سے لوگوں کی دوری کو ختم کرنے کے لیے دونوں جانبوں سے بے خبری کا علاج کرنا ہوگا۔

تقریب میں شریک ہونے والے ائمہ وخطبا نے اپنے اپنے دائرۂ کار میں اس کار خیر کو پھیلانے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں اب تک شہر کی تقریباً ۶۰ مساجد میں، جن میں خواتین کی تعلیم وتربیت کے ۱۵ مراکز بھی شامل ہیں، اس نوعیت کی کلاسز شروع ہو چکی ہیں۔ الشریعہ اکادمی میں اس وقت فہم دین کورس کی تین کلاسز جاری ہیں جس میں ۱۰۰ کے قریب نوجوان، بزرگ اور خواتین شریک ہیں۔